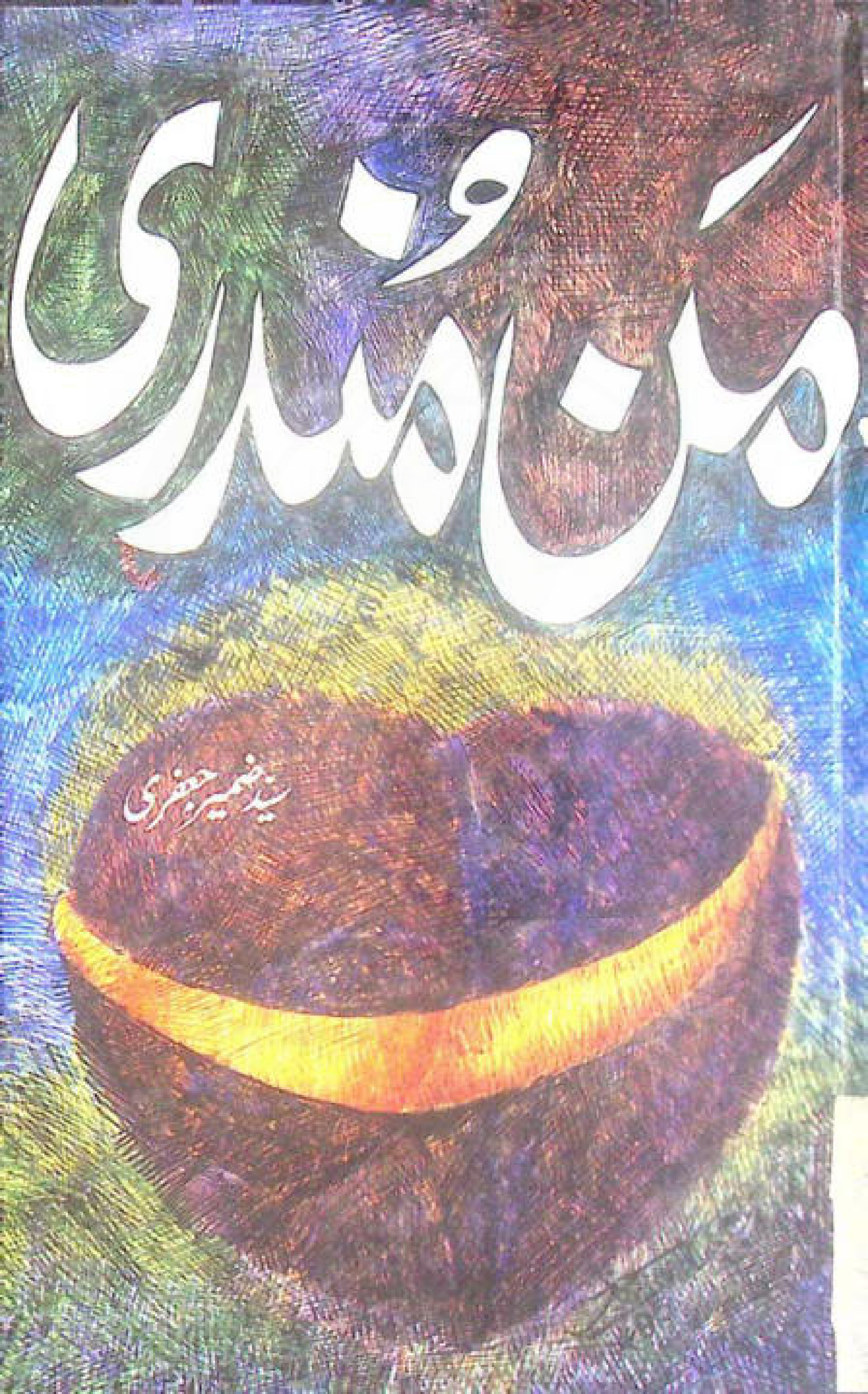

سید ضمیر جعفری

مَن مُندری

سیّد ضمیر جعفری

دوست پبلی کیشنز ۔ اسلام آباد

ضابطہ

کتاب : من سندری

مصنف : سید ضمیر جعفری

موسم اشاعت : مئی ۱۹۹۶ء

سرورق : مسعود اختر

مطبع : یونیورسل پرنٹرز

قیمت : 140.00 روپے

دوست پبلی کیشنز 8 ۔اے، خیابان سہروردی، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

وہ سُندری
جو تھی بِن مُندری

لفظ کی توہین ہے خوشبو سے خالی شاعری
شعر میں تیرا سراپا گنگناتا ہی پڑا

الف

ترتیب

ب

ج

د

ز

کوریائی شاعری ۲۰۹

حرف آخر ۲۲۵

پیش لفظ

کچھ نہیں ہے میرے پاس
اپنی آہوں کے سوا
اپنی نگاہوں کے سوا
اپنے گناہوں کے سوا

دعا

فضائے نیل گوں میں اک کھلا گھر بخش دے یارب
پرندوں کی طرح الفاظ کو پر بخش دے یارب

راہ و منزل

شاعری منزل نہیں
راستے کے کچھ اچانک
منظروں کا نام ہے

آدرش

تہہ بہ تہہ کیوں نہ ہو وہ پوشیدہ
ہم اُسے دیکھ لیں گے، جاں لیں گے
کون سی شے ہے جس میں حُسن نہیں
سینگ سے بانسری بنا لیں گے

نذرانہ

نعت و منقبت کے اشعار کی لسانی نسبت سے پنجابی زبان کے عظیم صوفی شاعر "صاحب سیف الملوک" حضرت میاں محمد بخشؒ کے اسلوب کی علاقائی گھلاوٹ کو قومی زبان میں گھولنے کی کوشش کی ہے۔

اللہ اللہ، اللہ اللہ شوکت شانِ جلیلی
لش لش چمکی سونا بن کر مٹی ۔۔ نیلی پیلی

باتوں میں "مشری کی ڈلیاں" زم زم کی سیرابی
لہجہ جس سے زندہ ہو گئے مردہ لفظ کتابی

صدیوں کی اندھی گلیوں میں روشنیاں لشکائیں
جس رستے پر چلتے جائیں، دیوے "بلتے" جائیں ۔

پتھر محلوں پر پھینکی خیموں کی نرم طنابیں
قلعوں کی قوسوں پر غالب مسجد کی محرابیں

ہر گدڑی پر موتی ٹانکے، بَن میں پھول کھلائے
اپنی "پیڑ" سمجھ کر جھیلے جس نے درد پرائے

مسجد میں وہ عجز کے سجدے، پہروں شب بیداری
حرب میں جس کی ضرب انوکھی، وہ لشکر سالاری

بے پایاں دل پُرسی جس کی، بخشش بے اندازہ
ہر آہٹ پر کُھلنے والا رحمت کا دروازہ

نئے خیالوں، نئے اجالوں، نئے رواجوں والاؐ
تن پر کالی کملی لیکن تختوں تاجوں والاؐ

روشنیوں کی "لائیں" مارے وہ پیکر نورانی
اسؐ کی پیشانی سے چمکی عالم کی پیشانی

ریتوں رسموں کی "بُنتر" کے بدل دیئے پیراتے
کھیت اسی کا جو ہل جوتے، جو بوتے سو کھاتے

سب سے عزت والا وہ جو سب میں "نیکوکارا"
انسانوں کے ذہن میں اس نے پورا چاند اتارا

امن سرائیں جس سائیں کے مکے اور مدینے
جس کی خاک پا سے چمکے عرش کے دھندلے زینے

مدنیت کے ایسے سدابہار گلاب "ایجادے"
اسکے "فیض نے صحراؤں میں کیا کیا شہر "آبادے"

انت نہیں جس بخشش کی، وہ بے پایاں سوغاتیں
دنیا پر برسائیں اُس نے سُکھ ساون برساتیں

وہ دانائے سبل کہ جس نے علم خزینے کھولے
وہؐ بولا تو صدیوں کے منہ بند زمانے بولے

اسؐ داتا کی دین جہاں کو، یہ آئینِ گرامی
سب انسان برابر جس میں کوئی خاص نہ عامی

صفت نبیؐ کا شوق فراواں کیونکر ہو گا پورا
اس منزل کا "پینڈا اوکھا" میرا رخت ادھورا

۴

رحمت اللعالمینؐ کے آستاں تک آ گئے
اِس زمیں پر آ کے گویا آسماں تک آ گئے

یہ تو کچھ منظر تھے جو لفظ و بیاں تک آ گئے
ہم جہاں تک جا نہ سکتے تھے وہاں تک آ گئے

اوّلیں میثاقِ آزادی جہاں لکھا گیا
وقت کے اس محورِ امن و اماں تک آ گئے

اے ولیٔ بے کساں، اے چارۂ بے چارگاں
درد کے مارے ترے دارالاماں تک آ گئے

لامکاں کی سمت ان دیکھے دریچے کھل گئے
وقت کے ساتھ اُڑتے اُڑتے ہم کہاں تک آ گئے

دکھ کی تپتی دھوپ میں ایسا سخی سایا کہاں
گنبدِ خضرا ترے "سکھ سائباں" تک آ گئے

کیا انوکھا ہے یہ خشت و سنگ کا تیال حُسن
ہم ستونوں سے لپٹ کر آسماں تک آ گئے

ذہن میں کانٹے بھری "چِنتائیں" پیچھے چھوڑ کر
ارضِ بطحا تیری خاکِ مہرباں تک آ گئے

یہ تو اس داتا کے لُطفِ بے نہایت کا ہے فیض
ہم سے واماندہ بھی پھر اس آستاں تک آ گئے

پاؤں گرد آلود ہیں لیکن یہ لگتا ہے ضمیرؔ
کہکشاں پر چلتے چلتے ہم یہاں تک آ گئے

کچھ اشعار مسجد نبوی میں حاضری کے دوران کہے گئے

کربلا کی بات

کس کی فتح مبیں پر وقت نے اپنی مہر لگائی
دنیا نے دیکھی اک فاتح لشکر کی پسپائی

موت کے نرغے میں کس عظمت، کس تسکین سے جینا
ہر خیمے میں اک چھوٹا سا مکّہ اور مدینہ

فصلِ حق و باطل کا وہ محکم فیصل دورلہا
اپنے ظرف مطابق مل گیا، جس نے جو بھی چاہا

جس سے دھندلا جاتی انسانوں کی کھری پیشانی
اس اجلے انسان نے ایسی کوئی بات نہ مانی

مقتل میں بستی بس جانا، ریت میں کھیت اُگانا
جنگ بظاہر ہار بھی جانا اور شکست نہ کھانا

موت کا سدا سہاگن ہونا، جیون امر کہانی
دریاؤں میں اب بہتا ہے بند فرات کا پانی

سر پہ نبیؐ کا پرچم اور دامانِ بتولؓ کا سایا
پاؤں میں لغزش نہیں آئی، نطق نہیں تھرّایا

آدرشوں کے آگے کیا حیثیت "جسماں جاناں"
اللہ اللہ آلِ نبیؐ کی جگمگ جگمگ شاناں

عمر رسیدہ لوگوں کی ضربت بھی ضربتِ کاری
چڑیوں کو بھی دیکھو ماری "بازاں" ساتھ "اڈاری"

عجب مسافر جس نے سب رستے روشن کر چھوڑے
خود ٹوٹا پر کتنے بھاری بھاری پتھر توڑے

خائف تھے امکانِ سحر سے شام کے شقی "وڈیرے"
لوٹ نہ آئیں کوفے میں یثرب کے سانجھ سویرے

خاموشی کے سنّاٹے میں بولی "قلم کلامی"
حق گفتارے جگ اُجیارے، ست بچنے، ست نامی

ان کی پیاس نے میتوں اندر رس چھاگل چھلکاتے
ان کے زخموں نے باغوں میں آج کے پھول کھلاتے

سونپ گئے ہر مقتل کو اک شامِ دل آرامے
شب کی پیشانی پر لکھے سورج کے سرنامے

ایک نئی قوت کو بخشی ایک امر طغیانی
درویشوں کی ٹھوکر میں تاج و تختِ سلطانی

اُس کی بات حیات کی شوبھا اس کی ذات زمانا
ایک دیئے کا بُجھ کر صدیوں کا سورج بن جانا

رب کی رضا پر ایسی رغبت سے گھر بار لٹاتا
اپنے لہو سے ایک انوکھا جشنِ گلاب مناتا

حق کی خاطر پیتا تو ہم بھی خوش دم پی لیتا
تیر کے پھل، نیزے کی انی کو سینے میں سی لیتا

نذرِ اقبالؒ

ذہنِ انساں کی کرامت تیرا شعر
زندگی کی ایک نعمت تیرا شعر

غزلیں

○

کس قدر ایمان محکم ہے خدا کی ذات میں
مطمئن چہرہ ہے اتنے مضطرب حالات میں

دیس کی مٹی اگر رکھتا ہے ملبوسات میں
ماہ و انجم خود اتر آئیں گے تیرے ہاتھ میں

طے ہوا سارا سفر لیکن مسلسل گھات میں
دو قدم کا فاصلہ تھا فتح میں اور مات میں

کس نے پائی ہے رضائے یار تاوانوں بغیر
یہ غلامی بھی نہیں ملتی کبھی خیرات میں

جلد سُن لیتے ہیں پنچھی صرصرِ صحرا کی چاپ
کونپلیں کیوں دفعتاً چُپ ہو گئیں باغات میں

مسترد بے شک کیا ہم کو ہمارے عہد نے
کچھ اضافہ تو کیا فہرستِ اعزازات میں

وہ فقیر اچھا جو گلیوں میں صدا دیتا رہا
ایسے درویشوں سے، جو گُم ہو گئے درجات میں

سب سے عالی ظرف انساں ایک ہل والا کسان
کھیت چڑیوں کو کھلا دیتا ہے جو سوغات میں

شعر کی شہر دھانے اور اک شخص کی شوبھانے دی
یہ جو ست رنگی دھنک جلتی ہے میری ذات میں

○

تسلّی جو ہے لفظوں میں اشاروں میں نہیں ہوتی
جو موسیقی ہے موجوں میں کناروں میں نہیں ہوتی

معزّز اور مقدّس ہے خدا کے ذکر سے مسجد
بڑائی گنبدوں میں اور مناروں میں نہیں ہوتی

جو یہ بے مہر عجلت ڈھل رہی ہے کارخانوں میں
خدا کا شکر ہے یہ کاشت کاروں میں نہیں ہوتی

دلوں کو فتح کرنا، پتھروں کو موم کر لینا
یہ درویشوں کی طاقت، تاجداروں میں نہیں ہوتی

یہ دنیا جس میں ہم ہیں ساری دنیاؤں سے بہتر ہے
یہاں کی چاندنی[1] خود چاند تاروں میں نہیں ہوتی

ہم ایسی شام اپنی زیست سے خارج سمجھتے ہیں
بسر جو اپنے یاروں اور پیاروں میں نہیں ہوتی

[1] یہ سائنسی چاندنی نہیں، محسوساتی چاندنی ہے

○

عشق اگر نہ کرتا میں
روز اک موت مرتا میں

کیا مکاں بناؤں گا
آندھیوں کا پالا میں

کم بگڑ سکا ورنہ
اور بھی سنورتا میں

ابر تھا مگر افسوس
پانیوں پہ برسا میں

لکھ رہا ہوں خوابوں سے
اپنی "دیو مالا" میں

جب وہ پاس تھا میرے
اپنے ساتھ سب تھا میں

اس کے واسطے مرنا
یہ بھی کر گزرتا میں

کھو گیا ہے شہروں میں
اک کسان لڑکا، میں

فطرتاً نہ تھا باغی
مرتا کیا نہ کرتا میں

شعرِ سہل و سادہ کا
آخری حوالہ میں

○

آدمی ہے دنیا میں
جیسے موج دریا میں

باوجود سورج کے
برف ہے ہمالہ میں

اس کی دید خوش آئے
جیسے دھوپ سرما میں

نیکی، اجر نیکی کا
چاند جیسے صحرا میں

جنگ ختم کب ہو گی
کعبہ اور کلیسا میں

اس کو گن رہا ہوں میں
آنسوؤں کی مالا میں

○

عشق اک دل کستوری ہے
کیا میٹھی مجبوری ہے

جیسے اک الھڑ لڑکی
دنیا ابھی ادھوری ہے

انساں کا بنیادی روگ
طاقت پر مغروری ہے

دنیا اپنی ذات بغیر
قطعاً غیر ضروری ہے

میری محرومی کا راز
میری شرمِ حضوری ہے

دل کو دل سے راہ نہیں
ورنہ کون سی دوری ہے

اس بے مہر سے اتنا پیار
کوئی تو مجبوری ہے

جسے محبت کہتے ہیں
بے اُجرت مزدوری ہے

سب سے سہل زمین اپنی
آدھی روٹی پوری ہے

دل دستک کے بغیر غزل
رسمی ہے، دستوری ہے

جیتا ہوں کہ ضمیر ابھی
کوئی کام ضروری ہے

○

دنیا بہت پرانی بھی ہے
لیکن بڑی سہانی بھی ہے

حُسن ہے اور جوانی بھی ہے
دریا میں طغیانی بھی ہے

میری پیش روی کا باعث
میری کم سامانی بھی ہے

سہل تو بات تھی کہنا، لیکن
بات اُن کو سمجھانی بھی ہے

ہر اک شخص کتاب ہے اپنی
ہر انسان کہانی بھی ہے

عظمت کی شرطوں میں شامل
تھوڑی سی نادانی بھی ہے

سارا عہد سنہرا جس میں
میرا یوسفِ ثانی بھی ہے

ایک بڑا کفرانِ نعمت
جسم کی نافرمانی بھی ہے

جاں کا دشمن بھی وہ ٹھہرا
وہ جو دلبر جانی بھی ہے

ایک عجیب سفر ہے جینا
اک مشکل ... آسانی بھی ہے

اس سے بڑی حقیقت کیا ہے
یہ دنیا جو فانی بھی ہے

طاقت کے ہیں بھیس ہزاروں
درویشی سلطانی بھی ہے

اس سے ملتے اور زیادہ
جو شے آنی جانی بھی ہے

جہلم، راوی، سندھ سلامت
مے سے بڑھ کر پانی بھی ہے

دیکھ ضمیرؔ ترے شعروں میں
تیری کوئی نشانی بھی ہے

○

اک شے میں ہے سہانے بھی
جاگ اٹھے درد پرانے بھی

ملنے کے ہزار بہانے بھی
مشکل یہ ہے وہ مانے بھی

انسان کی تنہائی نہ گئی
آباد ہوئے ویرانے بھی

اس دھن دھرتی کے کیا کہنے !
سونا گیہوں کے دانے بھی

جوگی کے بھیس میں کون تھا یہ
کوئی اس کو پہچانے بھی

سب عمر خلا میں کاٹ گئے
کب فارغ تھے دیوانے بھی

کچھ خوشی اچانک برس گئی
کچھ درد ملے انجانے بھی

کیوں ایسے شہر آباد کئے
لو بانجھ ہوئے ویرانے بھی

کیا چھلکی مے، مے خانے میں
جب ٹوٹ گئے پیمانے بھی

عارف لکھے تو جوان لگیں
الفاظ ہوں لاکھ پرانے بھی

○

اپنے دشمنِ جان رہے ہیں
دل کی باتیں مان رہے ہیں

یارو ! تم سے شکوہ کیسا؟
ہم تو بس حیران رہے ہیں

اس میں سونا، اس میں چاندی
اپنی مٹی چھان رہے ہیں

منزل کیا ملتی کہ ہم تو
رستہ ہی پہچان رہے ہیں

ان کو کیا شرمندہ کرتے
جان کے ہم انجان رہے ہیں

دو کپڑوں میں عمر گزاری
ہم کتنے آسان رہے ہیں

شہر بڑے آباد تھے لیکن
لوگ بہت ویران رہے ہیں

دنیا تجھ سے دل کیا بھرتا
دو دن تو مہمان رہے ہیں

○

کیا ساز میں آہنگ ہو مضراب نہیں ہے
احباب نہیں تو شبِ مہتاب نہیں ہے

ہر وقت اُفق دھند میں ڈوبا نہیں رہتا
شائد تیرے آئینے میں سیماب نہیں ہے

روتا ہوں کچھ اس طرح کہ آنسو نہیں بہتے
سیلاب ہے اور شہرِ تہِ آب نہیں ہے

دل کو نہ ملامت کرو آوارہ رَوی کی
وحشی ہے یہ خُو کردہ۔ آداب نہیں ہے

دلدادہ۔ بیدلؔ ہوں تو گرویدۂ غالبؔ
کمیاب مری طرز ہے نایاب نہیں ہے

○

نہیں یہ بات کہ انسان ابتلا میں نہیں
کوئی حسینؓ مگر آج کربلا میں نہیں

کشادِ پر میں ہے شاہیں کی سروری، ورنہ
ہے یہ بھی عام پرندہ اگر ہوا میں نہیں

فقیر لوگوں کے درویش دامنوں میں جو ہیں
وہ مہر و ماہ سلاطین کی قبا میں نہیں

ضمیر بھیگا ہوا شبنمِ ندامت میں
گناہ گار کی یہ چیز، پارسا میں نہیں

کوپن ہیگن، ڈنمارک (آصف خواجہ کے گھر)

○

حوصلے جب رواں ہوتے ہیں
برف پر بھی نشاں ہوتے ہیں

لوگ ہی بے دھیاں ہوتے ہیں
راستے مہرباں ہوتے ہیں

لوگ جو خوش گماں ہوتے ہیں
وہی دنیا کی جاں ہوتے ہیں

جنگلوں کے ہجوم پر مت جا
چند پودے جواں ہوتے ہیں

زندگی تیرا شہر دیکھ لیا
سارے کچے مکان ہوتے ہیں

سب سے مہلک اُنہی کو پایا ہے
تیر جو بے کمان ہوتے ہیں

آدمی کب ہوا کوئی تنہا
پاس ہی پاسبان ہوتے ہیں

منزلیں فاصلہ نہیں کرتیں
آپ خود درمیان ہوتے ہیں

ہاں زمینِ فرنگ بھی دیکھی
ہر جگہ آسمان ہوتے ہیں

سٹاک ہالم، سویڈن (جمیل احسن کے گھر)

○

ظاہر کی چمک کوئی بڑی بات نہیں ہے
افرنگ میں ظلمت ہے مگر رات نہیں ہے

عورت کا یہ اعزازِ طبیعت ہے خصوصی
عورت کے سوا اُس کی کوئی ذات نہیں ہے

اتنا ہی معزز ہے مری رائے میں وہ شخص
اس دورِ ریا میں بھی جو محتاط نہیں ہے

اک جیسے بزرگی میں نہیں ظرف کے درجات
ہر شخص کا مقسوم خرابات نہیں ہے

حق میں ہے اگر تیرے، ترے دل کی گواہی
پھر کوئی بُری بات، بُری بات نہیں ہے

ناکامِ محبت کو بھی ناکام نہ سمجھو
اس جنگِ مساوی میں کوئی مات نہیں ہے

اک طفل کی قیمت کے برابر نہیں دنیا
انسان سے بہتر کوئی سوغات نہیں ہے

کوپن ہیگن، ڈنمارک

○

یہ بہت کم ہے جہاں کی تیرگی کے واسطے
کوئی سورج اور یا رب روشنی کے واسطے

صبح ہو، دامانِ صحرا کی ہوا ہو اور ہم
تنگ ہیں یہ شہر تو آوارگی کے واسطے

غم سے نم پاتی ہے جاند اور کم قامت حیات
لازمی ہیں سانحے بھی آگہی کے واسطے

زندگانی کی حقیقت کچھ نہیں جز ایں قدر
مضطرب رہنا قرارِ عارضی کے واسطے

آج تک جو مل نہیں پائی، وہ مل جاتی اگر
ایک شب کافی تھی پوری زندگی کے واسطے

اک عجب نعمت ہے نامانوس چہروں کی کشش
بارہا دھڑکا ہے دل اک اجنبی کے واسطے

لازمی ہیں خوبصورت لوگ دنیا کے لئے
جس طرح ہیرے کا نگ، انگشتری کے واسطے

چند ہاتھوں کی ہے شاخوں پر ابھی تک دسترس
پیڑ چُن دیتے ہیں اپنے پھل سبھی کے واسطے

ہر کسی کا اک الگ اعزاز بے شک ہے، مگر
کربلا ہے صرف اولادِ علیؑ کے واسطے

آنکھ سے اوجھل نہ ہو پایا تھا خطِ شہر ابھی
دل تڑپ اٹھا مدینے کی گلی کے واسطے

درمیاں کتنے سمندر ہوں کہ دیواریں ضمیر
آدمی پیدا ہوا ہے آدمی کے واسطے

بریڈفورڈ برطانیہ (جاوید نقوی کے گھر)

○

انجام سفر سے ڈر رہا ہوں
اے شام..... سحر سے ڈر رہا ہوں

کن چاہتوں سے جسے بنایا
اب اسی گھر سے ڈر رہا ہوں

منزل نہ کہیں اسی طرف ہو
جس رہگزر سے ڈر رہا ہوں

رات تو جاگتے گزاری
صبح کی خبر سے ڈر رہا ہوں

اک کنجِ شاخسار چاہوں
اور شاخ و شجر سے ڈر رہا ہوں

اے شہرِ خوابِ خوب رُویاں
ہر سنگِ در سے ڈر رہا ہوں

آفاق کی خیر ہو الٰہی
انساں کے ہُنر سے ڈر رہا ہوں

اتنا تو خدا کا ڈر نہیں تھا
جتنا کہ بشر سے ڈر رہا ہوں

○

چلو ہم تم میں فاصلہ ہو جائے
کچھ سہی، کچھ تو فیصلہ ہو جائے

آج رونے کی انتہا ہو جائے
آج ہر درد کی دوا ہو جائے

دے اجازت اگر خدا کا خوف
آدمی جانے اور کیا ہو جائے

آج موسیٰ نہیں کوئی، ورنہ
بیچ دریا کے راستہ ہو جائے

پیڑ پر جانے کیا گزرتی ہے
جب پرندہ کوئی جُدا ہو جائے

کاش اس جسم کا ہر اک ذرّہ
کہیں جگنو، کہیں دیا ہو جائے

اے خدا اس زمینِ کُہنہ پر
آسماں تو ذرا نیا ہو جائے

رات کا بہترین مصرف ہے
گُلعذاروں میں رَتجگا ہو جائے

موت کے دن ضمیر کو دیکھو
جیسے قیدی کوئی رہا ہو جائے

○

دنیا اب ادراک کی اس منزل پہ مجھے لے آئی ہے
میں نے اپنی شکستوں سے کچھ اور بھی قوت پائی ہے

اتنی عمر گزرنے پر یہ بات سمجھ میں آئی ہے
راحت کیا کہ میری عبادت بھی میری تنہائی ہے

اک میٹھا سا درد، اک عزت والی بے پروائی ہے
عشق بے رسوائی لیکن کتنی پیاری رسوائی ہے

بیٹھا ہے بارُود پہ، ہاتھ میں جلتی دیا سلائی ہے
سائنس ہاتھ میں بندر کے، کتنی مہلک دانائی ہے

روح میں سنّاٹے کی یہ کیفیت پہلے تو کب تھی
شاید ہم نے آج اپنے بچپن کی گیند گنوائی ہے

سفرِ ثواب کا بن بنجر میں چلّے رختِ گنہ میرے
کانٹوں پر ننگے پاؤں چلنا بھی کوئی دانائی ہے

آزادی اک نعمت ہے آزادی کا اپمان نہ کر
اس کی قیمت ہم سے پوچھو ہم نے شکست بھی کھائی ہے

○

سورج دور نہیں ہے، ان ٹھٹھرے حالات سے نکلو بھی
رزق آوازیں دیوے ہے، تم بھوک کی رات سے نکلو بھی

کُھلا افق بھی کُھل نہیں سکتا، گھر کے بند کواڑوں پر
اپنے ہاتھ میں خود قیدی ہو، اپنے ہاتھ سے نکلو بھی

کوئی شہر نہیں بیگانہ، کوئی شخص نہیں دشمن
بات مگر بس اتنی ہے، تم اپنی ذات سے نکلو بھی

چاہت کی بس ایک ہی شرط ہے اپنی جان گزاری کی
کعبہ بھی آجاتا ہے لیکن "میقات" سے نکلو بھی

مٹی میں کتنے میوے ہیں، چہروں میں کتنا افسوں
دنیا کی سچائی کو برتو، شُبہات سے نکلو بھی

○

ہمہ خوبی اور ہمہ خیر مگر بے انت خطا کر سکتا ہے
اللہ کے سوا انسان کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے

اس جیسے خوش چہروں کے لئے سجدہ بھی روا کر سکتا ہے
مشکل ہی سہی یہ کام، خدا چاہے تو خدا کر سکتا ہے

شمشیر و سناں "بکتر بندوق، رَفل بارود" کے بس کا نہیں
جو فتحِ مبیں "اِکتارے" پر اک نغمہ سرا کر سکتا ہے

دیکھا ہے کبھی وہ جادو بھی جو تیری مُدھر آنکھوں میں ہے
سوچو تو سہی، انساں بھی تو ہوں، انسان خطا کر سکتا ہے

ذرّے کو بظاہر یہ سمجھے ذرّہ ہی تو ہے یہ کیا ہو گا
اندر کی قیامت کب دیکھی، یہ ٹوٹ کے کیا ہو سکتا ہے

اس دورِ ریا میں لوگو ایسے شخص سے بھی محتاط رہو
جو شخص وفا کر سکتا ہے، وہ جانے کیا کر سکتا ہے

حالات بھی بعض عناصر کی اس طرح مدد فرماتے ہیں
اک قطرہ جا کر دریا میں، طوفان بپا کر سکتا ہے

○

دل اُسی کی یاد سے آباد ہے
لب پہ جس کا نام آسکتا نہیں

وہ بھی کوئی آدمی ہے کام کا
جو کسی کے کام آسکتا نہیں

دل اگر بولے نہیں تو ہونٹ پر
رام یا ہرنام آسکتا نہیں

سر دبا آسکتی ہے لیکن ضمیر
میکدے میں جام آسکتا نہیں

○

کانٹوں ہی سے پھولوں کا گُل گواہ نکلے بھی
جنگوں میں جاؤ تو کوئی راہ نکلے بھی

فرق کچھ نہیں ایسا کعبہ و کلیسا میں
ذہن سے مگر پہلے اشتباہ نکلے بھی

موت کے بُلاوے پر معترض نہیں ہوں میں
دل سے زندگی کی لازوال چاہ نکلے بھی

○

مقروض ہوں گلشن کا، بیاباں کا نہیں ہوں
اللہ کا گنہگار ہوں، انساں کا نہیں ہوں

مشکل میں بھی میرے لئے آساں رہا جینا
گھر کا تو میں قائل ہوں، پہ ساماں کا نہیں ہوں

کعبہ سے بھی رغبت ہے، کلیسا سے بھی نسبت
صد شکر کہ قیدی کسی زنداں کا نہیں ہوں

ہوں شعر میں اک عام کھلے پن کا مسافر
میں رہن کسی خاص دبستاں کا نہیں ہوں

اس خشک زمیں نے بھی اگایا ہے مرا رزق
پروردہ فقط موسمِ باراں کا نہیں ہوں

○

کچھ سکوں طبیعت میں ہے تو اب، مگر جیسے
امن ملک میں قائم ہو گیا ہو لشکر سے

توڑ ڈالو تیشے سے راستے کا ہر پتھّر
چھین لو کلاہِ زر سائلو سکندر سے

کاش لوٹ آتے پھر شاعری کا وہ موسم
تھالیوں میں لاتیں ہم چُن کے پھول مندر سے

گردن کٹ گئی کالر سے
نیک ڈھلے ہیں "ڈالر" سے

کتنا سرد اور زرد ہوا
انساں ... انساں کے ڈر سے

مشرق و مغرب کے مابین
کنوئیں کی جنگ سمندر سے

مال برآمد کون کرے
نقب لگی ہے اندر سے

سورج مانگے ہے کرنیں
چھت لٹکی چمگاڈر سے

دفتر .... ہٹی کھٹی کی
حاکم ہیں ... سوداگر سے

جانے چھوٹے گی کب جاں
دارا اور سکندر سے

گھر کو آگ نہ لگ جائے
"ایٹم" کے "بجلی گھر" سے

سماں کیے اس دھوپ میں مانگ
چھاؤں ماں کی چادر سے

میرے شعر کی سرمستی
جہلم اور گوادر سے

○

کوچۂ دلدار میں ناچار جانا ہی پڑا
بلبلوں کو ناز پھولوں کا اٹھانا ہی پڑا

غم میں بھی یارو بہت ہی مُغتنم تھی زندگی
آخرِ کار آنسوؤں کو مسکرانا ہی پڑا

ایک رخ چلتی ہے چاہت آشنا رستوں کی چاپ
جس طرف نکلے تمہارا آستانہ ہی پڑا

لفظ کی توہین ہے خوشبو سے خالی شاعری
شعر میں تیرا سراپا گنگنانا ہی پڑا

یہ عجب رشتہ ہے جس کو یاد کرنا تھا ضمیر
وائے مجبوری، کہ اُس کو بھول جانا ہی پڑا

○

وہ خار و خس سے رنگیں تتلیوں کے پَر بناتی ہیں
محل ہو، جھونپڑی ہو، مائیں گھر کو گھر بناتی ہیں

یہ ریشم کے ملائم تار کتنے نرم و نازک ہیں
یہ پوشاکیں مگر انسان کو پتھر بناتی ہیں

نئی دنیا میں ماضی کی مروّت ڈھونڈنے والو
نئی قدریں بشَر کو صرف سوداگر بناتی ہیں

ہُنر گاہوں کے سانچوں کو بدل ڈالا ضرورت نے
جو خوشبوئیں بناتی تھیں، وہ اب خنجر بناتی ہیں

کسانوں کی ہتھیلی پر نہ جب اپنا پسینہ ہو
تو کھیتوں کو برستی بدلیاں بنجر بناتی ہیں

شکستیں عارضی پسپائیوں کا نام ہیں شاید
سڑک پر بھی بہادر چیونٹیاں لشکر بناتی ہیں

زمیں پر اپنے سالم پاؤں سے ناپ اپنی قامت کو
کہاں تک ایڑھیاں انساں کو قد آور بناتی ہیں

ترے پیکر کو چرواہوں کے خوابوں نے تراشا تھا
ہماری کھیتیاں تیرے لئے زیور بناتی ہیں

○

ہم کہ ہر ساعت گناہوں میں رہے
خاص اللہ کی نگاہوں میں رہے

بے نوا کتنی پناہوں میں رہے
سارے جھگڑے بادشاہوں میں رہے

امن کی خیرات ہم دیں گے کہ ہم
دشمنوں کے خیر خواہوں میں رہے

تھے عموماً بے سروسامان لوگ
جن کے چرچے کج کلاہوں میں رہے

کس طرح ہو گا ادا شکرِ خدا
کیسے کیسے جسم بانہوں میں رہے

کن خوش انجاموں کو منزل مل سکی
ہم تو ساری عمر راہوں میں رہے

یہ زمیں اتنی نہ سنولاتی، مگر
کچھ ستارے کارگاہوں میں رہے

○

کبھی کبھی یہ منظر بھی در آیا شعر شعاری میں
کتنے رنگ برنگ پرندے اڑ گئے ایک "اڈاری" میں

کتنی دور تک آنکھیں اُس کے قدموں قدموں ساتھ چلیں
جسم بھی ریشم جیسا اور پھر ریشم بھی "پھلکاری" میں

خاک بچھونوں پر لوگوں نے راتیں کیونکر کاٹی ہیں
تم کیا جانو یہ "جگراتے" اپنے "پلنگ نواری" میں

سیلِ مروت کیا کہنا ان اپنے "پنج دریاؤں" کا
ہم تو گلے لگا لیتے ہیں دشمن کو بھی یاری میں

جس کو دیکھ کے مرے بڑھاپے میں بھی بچپن جاگ اٹھا
ایک کھلونا ایسا تھا، "منیارن" کی "منیاری" میں

سہمے لوگو اب کوئی آواز محاذ سے کیا آئے
فرق بہت ہے لشکر آرائی اور لشکر داری میں

کیسے کیسے پیکر دیکھے چڑھتی بھری جوانی کے
کوئی چیز انوکھی تھی لیکن اُس سب سے پیاری میں

○

آدمی کی آن جب تک لاچپت ہوتی نہیں
اس کو اپنے تجربے کی معرفت ہوتی نہیں

ٹیلے کب صحرا میں چلتے ہیں ہواؤں کے بغیر
دل نہ ہمت دے تو بازو میں سکت ہوتی نہیں

اُن کی سطوت اور حکومت کو نہیں آتا زوال
جن شہنشاہوں کی کوئی سلطنت ہوتی نہیں

بات، جس میں خوف یا لالچ کی آلائش نہ ہو
جرم ہو سکتی ہے وہ لیکن غلط ہوتی نہیں

سجدہ جو رسماً کیا جائے، ادا ہوتا نہیں
چیز مجبوراً جو دی جائے "دیت" ہوتی نہیں

جس طرح سے تاج بے توقیر ہیرے کے بغیر
مملکت آزاد بے جمہوریت ہوتی نہیں

زندگی کے صدق کا مظہر ہرا ہرجائی چمن
جستجو بھی ہے، تو پھر بے جہت ہوتی نہیں

پھول اور انساں کا تو کیا ذکر، سنگ و خشت تک
کوئی بھی صورت ہو وہ بے خال و خط ہوتی نہیں

نظریہ۔ فن ہمارا یہ ہے کہ ہم سے ضمیر
عشق سے خالی رکھت ہو یا پرست، ہوتی نہیں

○

روز سورج کو گھر اتاروں گا
رات سے میں کبھی نہ ہاروں گا

وہ نہیں عمر جو گزاری ہے
عمر وہ ہے جو اب گزاروں گا

علم وہ ہے جو کام بھی آئے
فالتو بوجھ کو اتاروں گا

کائنات اس قدر ہی بکھرے گی
جس قدر میں اُسے نکھاروں گا

یہ بھی اسلوبِ جنگ ہے میرا
پتھروں کو بھی پھول ماروں گا

ہر کٹھن راستہ پسند آیا
خود کو میں توڑ کر سنواروں گا

لوگ دانا سمجھ رہے ہیں مجھے
یہ لباس ایک دن اتاروں گا

○

ہم بھی کچھ خوش تو نہ تھے اُن سے وفا کرنے کے بعد
سوچتے ہیں یہ مگر اب، انتہا کرنے کے بعد

جرم کا احساس ہوتا ہے دعا کرنے کے بعد
کتنے بت پُوجا کیے، اُس کو خدا کرنے کے بعد

یہ تو دو طرفہ روابط کی کُھلی توہین ہے
کُھل بھی جائے گر وہ دروازہ صدا کرنے کے بعد

ہم نے اس شدّت سے پھر کوئی دعا کی ہی نہیں
تجھ سے کافر اجنبی کو آشنا کرنے کے بعد

جانتے ہو تم تو بتلاؤ پتہ اُس شخص کا
ہاتھ میں سورج ہو جس کے، رتجگا کرنے کے بعد

میری حالت؟ اے مرے معبود تیرا شکریہ
جیسے کوئی آدمی اچھی خطا کرنے کے بعد

دوستوں کے بے وفا ہونے کا موسم آگیا
ہم نے اپنی سی بھی کی اُن کا کہا کرنے کے بعد

"٭مرگِ آہوئے غزل" پر اے خدائے مہرباں
تیری کیا حالت ہوئی، یہ سانحہ کرنے کے بعد

ایسے موسم بھی تو اب صیاد نے پیدا کئے
قید کرتا ہے پرندوں کو رہا کرنے کے بعد

توڑ تو ڈالا ضمیر اپنا سبو تُو نے، مگر
ساری دنیا تُجھ گئی یہ فیصلہ کرنے کے بعد

٭ منفرد جواں مرگ شاعرہ پروین شاکر کی اچانک حادثاتی موت پر۔

○

کس کرب سے دلداریِ حالات نہیں کی
مدّت ہوئی خود سے بھی کوئی بات نہیں کی

کتنے ہی شب و روز درخشاں تھے ترے پاس
تو نے ہمیں اک رات بھی خیرات نہیں کی

دنیا کی ملامت کو پرِکاہ نہ جانا
دل خوش ہے تو پھر کوئی بُری بات نہیں کی

الفاظ ضروری تھے پر الفاظ کی خاطر
میں نے کبھی توہینِ خیالات نہیں کی

غافل نہ تھا اک لحظہ تری یاد سے یا رب
اور یہ بھی ہے سچ تیری مناجات نہیں کی

کاٹی تو ہے اس دور کی قیدِ تنہائی
زنجیر کے لہجے میں مگر بات نہیں کی

منظور رہی قحط کی شدت ہمیں، لیکن
مانگے ہوئے ساون سے تو برسات نہیں کی

دنیا نہ کبھی تھی مری قامت کے برابر
ہم مر گئے لیکن نفیٔ ذات نہیں کی

اُس شخص کو کیا حال ضمیرؔ اپنا سنائیں
جس شخص نے جنگل میں کبھی رات نہیں کی

○

یہ اپنے خاص اسلوبِ انا سے عہد ہے اپنا
نہ بھولیں گے اُسے، اُس بے وفا سے عہد ہے اپنا

کبھی دریائے ہستی کے بہاؤ پر نہیں بہنا
علیِ مرتضیٰ، مشکل کُشا سے عہد ہے اپنا

بشر کے حقِ نسیان و خطا کی لاج رکھیں گے
مرے مالک، ترے عفو و عطا سے عہد ہے اپنا

کوئی بھی پھول قبل از وقت مرجھانے نہیں دیں گے
سحر کے وقت کی بادِ صبا سے عہد ہے اپنا

کوئی پیوند تو ہو گا مگر دھبہ نہیں ہو گا
یہ اس سادہ قبائے کم نما سے عہد ہے اپنا

یہ مٹی ماں ہے، اس کی آن اپنی جان سے پیاری
زمینِ پاک کی خاکِ شفا سے عہد ہے اپنا

ہمارے جسم سے مس ہو کے گزرے گی ہر اک خوشبو
یہ چشمِ نم سے دستِ نارسا سے عہد ہے اپنا

اگر لکھا گیا ہم سے تو وہ چمکے گا، بولے گا
یہ اپنی حسرتِ حرفِ نوا سے عہد ہے اپنا

ترے بندوں کو بندوں کا خدا ہونے نہیں دیں گے
یہی بس ایک تو اپنے خدا سے عہد ہے اپنا

کبھی جام و سبو سے کوئی بد عہدی نہیں ہو گی
ضمیرؔ اس دیس کی آب و ہوا سے عہد ہے اپنا

○

کبھی وحشت میں مسل دیتا ہے انسان لباس
ایک ابھرے ہوئے دھاگے سے نہ پہچان لباس

مسئلہ اپنی خفی ذات کی دریافت کا ہے
ہے کبھی جسم لباس اور کبھی جان لباس

دل کی تسکین تری جاں میں ہے، ساماں میں نہیں
اتنا آسان جیا، جتنا تھا آسان لباس

کچھ ضروری تو نہیں ہو وہ پریشان خیال
آدمی جو نظر آتا ہے، پریشان لباس

اپنا اپنا ہے ہر اک شخص کا اسلوبِ شناخت
ہم سے منسوب ہوا چاکِ گریبان لباس

○

جتنا وقت انساں کی دل دہی میں گزرا ہے
وہ حقیقتاً حق کی بندگی میں گزرا ہے

غم بھی کم نہیں دیکھے، پھر بھی ایسا لگتا ہے
زندگی کا سب رستہ دلکشی میں گزرا ہے

یہ تو خاص نسبت کا عام سا کرشمہ تھا
ہجر کا اندھیرا بھی روشنی میں گزرا ہے

ایک اس کے ہونے سے گھر میں کیا نہ تھا اپنے
زندگی کا کچھ عرصہ اس طرح بھی گزرا ہے

دوپہر کو وہ آئی ننگے پاؤں کوٹھے پر
چاند چودھویں کا آج دھوپ میں بھی گزرا ہے

○

استحصالی مایا ---- موت کی دایا ہے
جنگ --- نظامِ زردار ی کا سایا ہے

کچھ نہیں تھا تو کیوں اکثر یاد آیا ہے
عمر کا حصّہ جو بے کار گنوایا ہے

رغبت رکھی کچھ دلچسپ گناہوں سے
دنیا تیرا کچھ تو قرض چکایا ہے

اپنی ریل اور اپنی پٹڑی ٹھیک، مگر
انجن کس کی بھٹی سے ڈھلوایا ہے

اس بندوق کا لوہا سونے سے بہتر
جس نے کوئی آمر مار گرایا ہے

ہر مسیا خیرات تھی جسم جوانی کی
مایا، کایا، سارا مال پرایا ہے

اپنے گھر میں اتنا خوفزدہ، جیسے
کوئی دہشت گرد مرا ہمسایہ ہے

راحت رس پاتی ہے کڑی اذیت سے
دھوپ نے میرے گھر میں درخت لگایا ہے

طاقتور پتھر توڑے تو دھرتی پر
ایک نئی طاقت کا دریا آیا ہے

اصل میں ہر ایوان غریب کسان کا ہے
جو پھل پایا، ہل کے "پھل" سے پایا ہے

حرف کی حُرمت کی خاطر تلوار نے بھی
ہر اک عہد سے اپنا عہد نبھایا ہے

پھول سی نظمیں لکھنے والے شاعر نے
سوچو کیوں لوہے کا سخن اپنایا ہے

○

نزع کے وقت بھی کچھ چہرے پہ زیبائی ہو
جنگ ہارو بھی تو تلوار پہ رعنائی ہو

اپنے تکمیلِ مدارج کے لئے لازم ہے
غمِ ہستی سے بھی بھرپور شناسائی ہو

خیر و خوبی کی پرکھ فرد کا اپنا احساس
کچھ گناہوں کی بھی شدت سے پذیرائی ہو

ان کے چہرے کی طراوت سے لگے ہے، جیسے
شیخ صاحب کو کوئی حُور نظر آئی ہو

روز چہرہ کوئی بانکا نظر آجاتا ہے
جی رہے ہیں کہ ابھی اور بھی رسوائی ہو

خوابِ آزادی کی تعبیر تو دیکھو، جیسے
شیر کے بچے کی ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہو

ملتفت بھی ہیں، گریزاں بھی ہیں وہ مجھ سے ضمیرؔ
جیسے برسات نہ ہو اور گھٹا چھائی ہو

○

زندگانی سے استفادہ کرو
فرصتِ کم کو کچھ زیادہ کرو

وقت کے بھی مطالبات ہیں کچھ
چاند راتوں میں جشنِ بادہ کرو

ماہ و انجم کچھ ایسے دُور نہیں
تم ذرا ہاتھ تو کُشادہ کرو

جبرِ ماحول اگر زیادہ ہے
اور بھی سرکشی زیادہ کرو

پردہ داری مریض جسموں کی؟
خوش لباسوں کو بے لبادہ کرو

کیا عجب یہ جہاں سنور جاتے
تم خرابی کا تو ارادہ کرو

خاکِ پامال کے نمو کے لئے
شہسواروں کو پا پیادہ کرو

اپنے عنبر سرشت بوسوں سے
لمحے لمحے کو رقص زادہ کرو

شہر کی دھند سے نکل کے ضمیرؔ
احترامِ زمینِ سادہ کرو

○

مسجد و مکتب خوش افکاراں بغیر
موسم برسات ہے باراں بغیر

ہم کو نامنظور ہر آسودگی
غم گساراں اور لاچاراں بغیر

شہر میں انبوہِ انساناں تو دیکھ
بے سروں کی بھیڑ دستاراں بغیر

لاکھ چمکاؤ سجیلی بوتلیں
میکدہ ویران مے خواراں بغیر

ساری دنیا ایک گھر بن جائے گی
گھر مگر بنواؤ دیواراں بغیر

دل کی ویرانی کا عالم کیا کہیں
شہر جیسے دوستاں یاراں بغیر

اب تو صحرا اور ویراں ہو گئے
ہرنیاں حیران ہیں "ڈاراں" بغیر

میری بینائی مرے کس کام کی
ماہ رُخساراں کے دیداراں بغیر

مسترد کر دی ادھوری زندگی
خوبصورت زُود آزاراں بغیر

زن کی حرمت کا محافظ مرد ہے
وادیاں پامال، کہساراں بغیر

○

جس طرف اس کی نظر ہوتی گئی
شب پہ ہر منزل سحر ہوتی گئی

ایک لمحے کو خیال آیا ترا
پھر یہ بارش رات بھر ہوتی گئی

ہانپ کر شہروں کی گلیاں رُک گئیں
ریگِ صحرا ...... ہمسفر ہوتی گئی

رابطہ جینے سے اتنا بڑھ گیا
عمر جتنی مختصر ہوتی گئی

کس نے پہچانا ہوس کا مرتبہ
چاندنی اک دربدر ہو گئی

جسم جذبے سے بہت مربوط تھا
مے کی مینا کو خبر ہو گئی

خوش رہو گے تم مگر اک شرط ہے
کوئی نادانی اگر ہو گئی

خاک پر کچے پھلوں کا ڈھیر تھا
کوئی سازش پیڑ پر ہو گئی

○

یادِ ایامے ہجومِ غم میں بھی دل شاد تھا
اپنے ویرانے میں اک شہرِ نوا آباد تھا

جو بھی محرومی تھی وہ تھی پیش قدمی کی نوید
ہر شکستِ جام میں، شورِ مبارک باد تھا

ہم نے یہ دیکھا کہ اس دنیا کے اندر آدمی
جس قدر محروم تھا، اتنا ہی وہ آزاد تھا

فرق مسند کا نہیں ہے، مسند آراؤں کا ہے
ایک ہی قریہ کبھی کوفہ، کبھی بغداد تھا

دل کے بجھ جانے سے شاید بجھ گئے سارے چراغ
گوشہ گوشہ اس خرابے کا پرستاں زاد تھا

بستیوں کی بھیڑ میں میری صدا کس نے سنی
ورنہ میرا جسم سر تا پا، ہمہ فریاد تھا

آمروں کے امن کی صورت تھی اپنی زندگی
کوچہ و بازار تھے سنسان، شہر آباد تھا

لوٹ کر خود اپنے پاس کیا کبھی ہم آئیں گے
ساتھ ساتھ دنیا کے کتنی دور جائیں گے

گائیں گے وفا کے گیت سردمہر گلیوں میں
بے چراغ بستی میں آگ تو جلائیں گے

زندگی کے رشتوں کو ایک موڑ پر آ کر
تم بھی بھول جاؤ گے، ہم بھی بھول جائیں گے

بے خیال خوابوں کی، بے کتاب دنیا میں
دل ہی بے عبارت ہے، چہرے کیا بتائیں گے

دیکھیں کب تک آتی ہے اس مقام پر دنیا
خاص محفلوں میں جب عام لوگ آئیں گے

شمعِ فن جلا کے تم جس گپھا میں جا بیٹھو
لوگ جنگلوں میں خود راستہ بنائیں گے

کیا بعید ہے یارو یہ بھی اس کی رحمت سے
ہم فصیلِ کعبہ کو بے غلاف پائیں گے

لفظ سے ضمیر اپنا یہ معاہدہ طے ہے
جنگ کے محاذوں پر نیشکر اُگائیں گے

○

جعفری خوش بخت ہے
مفلسی میں مست ہے

درمیانِ بود و ہست
فاصلہ یک جست ہے

فرض ہے کوشش مگر
اپنا اپنا بخت ہے

آج تک زندہ رہا
پھول کتنا سخت ہے

دھوپ میں اس کا خیال
بادلوں کی گشت ہے

اتنا ہی آساں سفر
جتنا ہلکا رخت ہے

نعمتیں کچھ کم نہ تھیں
آدمی کم دست ہے

میرے دل ہی کی طرح
ملک بھی دو لخت ہے

○

اپنا گھر جلانے سے روشنی نہیں ہوتی
دھوپ دھوپ ہوتی ہے، چاندنی نہیں ہوتی

خالی از ہنر کوئی شاعری نہیں ہوتی
سادگی جو لگتی ہے سادگی نہیں ہوتی

خُلد کی طہوروں کے ضمن میں یہ سنتے ہیں
ذائقہ تو ہوتا ہے بے خودی نہیں ہوتی

جس میں دوستوں کی بس خوبیوں سے مطلب ہو
کاروبار ہوتا ہے، دوستی نہیں ہوتی

بستیاں بسائی ہیں بادلوں کے جنگل میں
چاند تو نکلتا ہے، چاندنی نہیں ہوتی

دل میں زرد پت جھڑ کا کچھ عجیب موسم ہے
دن تو خیر کب نکلا، رات بھی نہیں ہوتی

اک ہرن کے بچے کو گھر میں جب سے پالا ہے
ہم سے اب کسی سے بھی دشمنی نہیں ہوتی

○

میوے بٹ گئے بازوں میں
چڑیاں مر گئیں باغوں میں

نیّت میں جب آیا کھوٹ
فرق پڑا اندازوں میں

جلتے جلتے آخر کار
بُجھ گیا تیل چراغوں میں

قتل، نہتے لوگ ہوئے
جنگ تھی تیر اندازوں میں

○

بے وفاؤں سے بھی پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں
بند کوچے میں بھی دروازہ کھُلا رکھتا ہوں میں

اپنی منزل شائد ان سب سے جدا رکھتا ہوں میں
قافلے میں ہوں مگر، کچھ فاصلہ رکھتا ہوں میں

اس سے بڑھ کر زندگی کیا اور نعمت دے مجھے
جسم فاسق اور روحِ پارسا رکھتا ہوں میں

خوش امیدی اور حُسنِ ظن مرا کیشِ حیات
موت سی شے سے بھی امیدِ شفا رکھتا ہوں میں

خواہشوں کی قتل گاہوں سے نہیں ہوں بے خبر
پیڑ ہوں میں، اپنے پتوں کا پتا رکھتا ہوں میں

کوئی شے مانوس سی نا آشنا چہروں میں تھی
اجنبی لوگوں سے بھی دل رابطہ رکھتا ہوں میں

اتنی عجلت ہے کہ پوری بات کم سنتے ہیں لوگ
ہر ملاقاتی سے تھوڑا سا گلہ رکھتا ہوں میں

روشنی اجزا میں تو کوئی سنہری شے نہیں
دوپہر کو اپنے گھر میں رت جگا رکھتا ہوں میں

امتزاجِ حسن و معنی اک محیطِ بے کراں
شعر کے دریا میں اک کچا گھڑا رکھتا ہوں میں

عمر گزری اس عدالت کے کٹہرے میں ضمیر
اپنے اندر بھی تو میزانِ سزا رکھتا ہوں میں

○

دلہنیں سجاتے ہیں دوسروں کے زیور سے
پیرہن بناتے ہیں مقبروں کی چادر سے

اگلی بارشوں کی دھند تاکہ کچھ سُلجھ جائے
مسکرا کے گزرا ہوں ہر اداس منظر سے

خندقیں عبث کھودیں ہم نے اپنے کھیتوں میں
شہر کی فصلیں تو ٹوٹتی ہیں اندر سے

کچھ تو برف پگھلی ہے روس کے پہاڑوں پر
پہلی جنگ ہاری ہے باز نے کبوتر سے

ہر قدم پہ اک الجھن دل ہی نے تو پیدا کی
اپنی ہر خرابی کی ابتدا ہوئی گھر سے

کچھ سکوں طبیعت میں ہے تو اب، مگر جیسے
امن ملک میں قائم ہو گیا ہو لشکر سے

توڑ ڈالو تیشے سے راستے کا ہر پتھر
چھین لو کلاہِ زر سائلو سکندر سے

کاش لوٹ آتے پھر شاعری کا وہ موسم
تھالیوں میں لائیں ہم چُن کے پھول مندر سے

○

دنیا سے میں گریز تو کرتا نہیں رہا
پر اس طرح جیا ہوں کہ مرتا نہیں رہا

اپنی شناخت اپنا قبیلہ نہیں رہا
ساگر میں بگر گیا ہوں تو دریا نہیں رہا

اے یادِ یار، تیری مروّت کا شکریہ
تنہا بھی میں رہا تو اکیلا نہیں رہا

اک قصر کیا بتا کہ محلّے اُجڑ گئے
پیڑوں پہ دیکھتے کوئی پتا نہیں رہا

آنکھیں بجھیں تو چاند ستارے بھی بجھ گئے
دل مر گیا تو شہر بھی زندہ نہیں رہا

دیر و حرم کے ربط سے منکر نہیں ہوں میں
لیکن کسی پڑاؤ پہ ٹھہرا نہیں رہا

محرومیوں پہ میری مت اتراؤ دوستو
یہ کم نہیں کہ میں کبھی تم سا نہیں رہا

اس طرح زندگی کا سفر طے ہوا ضمیرؔ
روشن ہوا الاؤ تو خیمہ نہیں رہا

○

غمگیں ہیں آزردہ نہیں، ٹوٹے مگر بکھرے نہیں
ہم خود سے بھی روٹھے نہیں، ہم جاں سے بھی گزرے نہیں

در ہیں مگر کھلتے نہیں، رستے تو ہیں چلتے نہیں
شہروں میں اب الھڑ گلابی رنگ کے لڑکے نہیں

ہم کو لئے پھرتے رہے وہ نقش جو بنتے نہیں
ہم کو جواں رکھتے رہے وہ خواب، جو دیکھے نہیں

وہ مجتنب تو کیا عجب، ہم مضطرب تو کیا ہوا
آبِ رواں کہاں ڈرتے نہیں، جنگل کہاں جلتے نہیں

کچھ لمس گرم اجسام کے، کچھ خط کسی کے نام کے
ہم اور کوئی شے بنامِ زندگی رکھتے نہیں

بادل نہیں برسے مگر، قبریں ہیں اپنے کھیت میں
ہم زندگی کی جنگ میں مارے گئے، ہارے نہیں

منزل کہاں، کیسا سفر، ہم کیا، ہمارا عزم کیا
ہم پاؤں رکھتے ہیں جہاں اکثر، وہاں پڑتے نہیں

○

لوگ اجنبی بھی ہیں، لوگ آشنا بھی ہیں
منزل ایک ہے لیکن راستے جُدا بھی ہیں

کتنی منصفی برتی اب کے سیلِ طوفاں نے
ساحلوں پہ جو ڈوبے اُن میں ناخدا بھی ہیں

مختلف بھی ہوتی ہیں خلعتیں فقیروں کی
خوش لباس لوگوں میں کتنے اولیا بھی ہیں

○

رشتہ ہمارا صبح سے تھا شام سے نہ تھا
آغاز سے تھا واسطہ انجام سے نہ تھا

آسائشوں کے سیلِ سبک سر کے باوجود
کوئی بھی شخص شہر میں آرام سے نہ تھا

رونق مرے مکان کی سامان سے نہ تھی
مے سے معاملہ تھا مرا جام سے نہ تھا

ہر چیز مل گئی ہے تو کتنا اداس ہوں
اتنا خراب کوششِ ناکام سے نہ تھا

ہم ہی نہ موسموں کا تقاضا سمجھ سکے
شکوہ تھا خود سے گردشِ ایّام سے نہ تھا

دیمک تھی کوئی روح کے اندر لگی ہوئی
افسردہ آدمی فقط آلام سے نہ تھا

اتنی مزاحمت کے سزاوار ہیں ضرور
کعبے سے ربط تھا، مگر احرام سے نہ تھا

تیرے لئے یہ مجلسِ "احبابِ ڈینیور"
واقف یہاں تو کوئی ترے نام سے نہ تھا

دل میں مرے بھی تاج محل تھا مگر ضمیر
منسوب چند پتھروں کے نام سے نہ تھا

۲۰ اکتوبر کو ڈینیور یونیورسٹی (امریکہ) کے ایشیائی طلباء نے اس فقیر کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ (ص)

○

پھول اور خنجر کی دوستی نہیں ہوتی
آگ کے الاؤ میں پھلجھڑی نہیں ہوتی

جیل کے ضوابط میں یہ نئی رعایت ہے
ہاتھ کاٹ دیتے ہیں ہتھکڑی نہیں ہوتی

ہاں سمیٹنی ہوں گی مہرومہ کی کرنیں بھی
گھر میں گھر جلانے سے روشنی نہیں ہوتی

ہر بڑی عمارت میں خون کی ہے آلائش
کون سے "پلازے" میں جھونپڑی نہیں ہوتی

حُسن ایک بدلی ہے جب جہاں برس جائے
ہر جوان "شہزادی" "سوہنی" نہیں ہوتی

○

خواب محسوسات سے آگے نہ تھے
ہم خود اپنی ذات سے آگے نہ تھے

یہ ستارے ساتھ کیا چلتے مرے
یہ تو خود اک رات سے آگے نہ تھے

آسماں پر جتنے بھی فانوس تھے
وہ ہمارے ہاتھ سے آگے نہ تھے

اُس کے وعدوں پر یقیں کرتے رہے
جس کے وعدے بات سے آگے نہ تھے

سب سے پیچھے ہم نہ کیوں رہتے کہ ہم
صورتِ حالات سے آگے نہ تھے

عشق کر سکتا ہے شاعر یا فقیر
فلسفی شبہات سے آگے نہ تھے

○

کون دیکھے گا اندھیرے کو سویرا دیکھ کر
کچھ نظر آیا نہ ہم کو تیرا چہرہ دیکھ کر

ایک دریا اور بھی ہوتا ہے ہر دریا کے پار
ہم تو ہمت ہار بیٹھے ایک دریا دیکھ کر

ان ننھے قدموں سے کب پہنچا ہے منزل پر کوئی
کر رہے ہیں ہم سفر صحرا میں رستا دیکھ کر

منگتوں کے واسطے سنتوں کی پیشانی بھی رکھ
کُٹڈ پر راول تو آ بیٹھیں گے ڈیرا دیکھ کر

ہم نے تو اک اپنے جیسا شخص بھیجا تھا وہاں
لوٹ آتے قصرِ سلطانی پہ پہرہ دیکھ کر

تجزیہ سادہ سے لفظوں میں مرے حالات کا
لشکرِ اعدا نے آ گھیرا ہے تنہا دیکھ کر

میں تو سر سے پاؤں تک خود ہی زرد پیلا ہو گیا
ان سیہ زلفوں پہ دوپٹہ سنہرا دیکھ کر

کچھ جزیرے خواب یادوں کے ابھر کر آ گئے
اُس کی آنکھوں میں سمندر نیم گہرا دیکھ کر

ڈھونڈتا ہوں پھر انہی گلیوں کو اپنے شہر میں
اپنے ویراں گھر کے دروازے پہ تالا دیکھ کر

کتنے انسانوں کے چہرے مسخ دیکھے ہیں ضمیرؔ
قصرِ شاہی کا کوئی روشن جھروکا دیکھ کر

○

اچھا ہے کہ اک دن مرنا ہے
مشکل کو تو آساں کرنا ہے

دھرتی بھی ماں سے کم تو نہیں
کچھ سوچ کے پاؤں دھرنا ہے

پھر سُود و زیاں کا کیا لیکھا
جو کرنا ہے سو کرنا ہے

اس پُل کو مت مسمار کرو
جس پُل سے پار گزرنا ہے

○

ہاں دیکھا ... ایسا بھی دیکھا
دریا میں صحرا بھی دیکھا

لاکھوں کا دل توڑنے والے
آج تجھے تنہا بھی دیکھا

بول نہ بول ... مگر سچ کہنا
تو نے کوئی ہم سا بھی دیکھا

اب مر جانا کیا مشکل ہے
جینے کے بینا بھی دیکھا

لوگ تو صرف تجھی کو دیکھیں
ہم نے تیرا مشا بھی دیکھا

آزادی کی قدر نہ جانی
آدھا ملک گنوا بھی دیکھا

دولت کے سیلاب رواں میں
بچوں کو بھوکا بھی دیکھا

جنگ میں دونوں ہی زخمی تھے
ہارا کیا جیتا بھی دیکھا

اندھی سے اندھی راتوں میں
ایک دیا جلتا بھی دیکھا

(ق)

اجڑے شہروں کے ملبے میں
اک رستہ چلتا بھی دیکھا

لطفِ شعر کچھ اور ہی شے ہے
اپنے شعر کو "گاتا" بھی دیکھا

فردیات

میری روح کا اس میں اظہار ہے
روایت مرے گھر کی دیوار ہے

دیکھتے صحرا کا جلنا موسم باراں کے ساتھ
ہم اکیلے رہ گئے ہیں لشکر یاراں کے ساتھ

میں اک اک لفظ کو اس طرح سے تسخیر کرتا ہوں
کہ ہر اک شعر میں دنیا نئی تعمیر کرتا ہوں

فطرت کی نہیں یہ انسانوں کی خود اپنی تعزیریں ہیں
جب پیدا تو آزاد ہوا، کیوں پاؤں میں زنجیریں ہیں

میں نہ دے سکوں گا جب کچھ بھی اس زمانے کو
ایک بوند کافی ہے میرے ڈوب جانے کو

جھونکا ہے تو خوشبو بن
کیڑا ہے تو جگنو بن

نظمیں

رابطہ

دنیا بھر کے سب انسان

اک زرعی میداں کے پیڑ

دھڑ ہے الگ پر جڑ مربوط

مٹی کے نیچے دیکھو

دور نہیں بیری سے "توُت"

کرنوں کے رقص کو عام کرو

یہ سورج مری ضرورت ہے
ستیال خوبصورت ہے
شبنم کو چمکانے والا
سوتے شہر جگانے والا
جنم دیا اس داتا نے
باغی فاتح جذبوں کو
سدا سکندر خوابوں کو
کھیتوں میں دہقانوں کے مہتابوں کو
کھینچ کے لایا صحرا میں سیلابوں کو

سُرخ جن سورج

ذہن و خیال میں

دل اور جاں کے ہر امکاں میں

جیون جوت جگاتا ہے

صدیوں سے انسانوں کے رخساروں پر

اپنا سونا بکھراتا ہے.....

دھرتی پر دھن برساتا ہے

اور اگلی صبح کو پھر اپنا.....

کیسۂ زر بھر لاتا ہے

طاقت کا اُبلتا چشمہ.....

تسخیر کا سیل.....

انا کی، وفا کی، بقا کی سنہری مُورت ہے

سورج مری ضرورت ہے

جب شہر مذیر سے یا نیلے پیلے ٹیلے.....

کی نرم لکیر سے چڑھتا ہے

اس کے قرطاس کے ساتھ مرا قد بڑھتا ہے

مہراج کمار ہے روشنیوں کا
لوگو! اس کی جے بولو

کرنوں کے رقص کو عام کرو

فطرت کے سخی گھرانے کے
اس شہزادے کو سلام کرو
ابھرے تو کتابِ ہستی کا
زرّین ورق بن جاتا ہے
ڈوبے تو شفق بن جاتا ہے
صُبحوں کے دریچے میں آ کر
اس شورش سے دِکھلا لو
اس سورج نے
پر تھی تو کیا آکاش پہ بھی
پر کاش اپنے سے
لمبی رات نہ ہونے دی
ظلمات کے لشکر کے ہاتھوں

انسان کو مات نہ ہونے دی

ہر صبح کا سورج

رواں دواں

ہر آن جواں

ہر گام تپاں

اک نئے جنم کی مہورت ہے

یہ سورج مری ضرورت ہے

جنگل میں بولتی کوئل

نگلی کوئل تیری کوک
دل کے زخم لہو میں چلنے والی
دھیری دھیری چاپ
جیسے بنجاروں کے نیم آباد.....
گھروں کے چوپالوں میں
ٹوٹی بانسریوں کی مدھم.....
میٹھی میٹھی ہوک
نگلی کوئل تیری ہوک
یہ پاگل متوالا درد

موتی، منکے والا درد

پھولوں، پتوں، پودوں کو مُسکاتا ہے
سوئی مٹی کے سینے میں
جیون رس چھلکاتا ہے
کتنے رنگ جگاتا ہے
محرومی کا یہ من جیت منوہر گیت
دریا کی لہروں میں بہتا.....
روتا، ناچتا، گاتا ہے
دُور اک دھندلی بستی میں
برہا ماری اک ناری کی کُٹیا میں
روشن دیپ جلاتا ہے
گہری گھنی اداسی کے
اس بے جگنو ویرانے میں
جاں میں گھُلتی آوازوں کا اک "شرمیلہ".....
بھر جاتا ہے

پیڑ سے گر کر اک دن تو

جس مٹی پر مر جائے گی
اس کو امر کر جائے گی

(ویسٹ آسٹریلیا)

بھائی کی قبر پر

برادر اکبر سید بشیر حسین شاہ کی یاد میں، جن کا انتقال 18 جون 1990ء کو ہوا۔ (ص)

مری تاب و تواں، تعمیر و زیبائی کی تربت ہے
یہ تربت میرے ماں جائے بڑے بھائی کی تربت ہے

بشیر، اسلوب، ایثار و مروت کی بشارت تھے
مرے صدیوں کے عالی شان ورثے کی علامت تھے

کئی صدمے فقط تیرے سہارے سہہ گیا ہوں میں
بھری دنیا میں لیکن اب اکیلا رہ گیا ہوں میں

بہن کوئی اگر ہوتی، کہ زندہ ماں ابھی ہوتی
نہ جانے وہ سمندر آنسوؤں کا کس طرح روتی

ستارہ برکتوں کا میرے سر پر ضو فگندہ تھا
جو تو زندہ تھا، ماں زندہ تھی، میرا باپ زندہ تھا

تو "احمد شاہیوں"[1] کے گھر کی رخشندہ روایت تھا
غریبی میں معزز، سادگی میں خوبصورت تھا

قناعت، صبر و استغنا میں ہمراہانِ اہلِ دل
جنہیں جینا بھی ہے آسان، مرنا بھی نہیں مشکل

ترے لہجے میں لفظِ آشنا اب کون بولے گا
خطاؤں پر مری حرفِ دعا اب کون بولے گا

خموشی میں دلوں کی داستاں اب کون بولے گا
وہ بولی جو تھی اتنی مہرباں اب کون بولے گا

بھتیجوں کو خدا رکھے سعادت مند ہیں لیکن
برادر سے برادر کی زباں اب کون بولے گا

1۔ ہمارا خاندان جدِ امجد سید احمد شاہ کی نسبت سے "احمد شاہی" کہلاتا ہے

موت

نئی دنیا کے رواں منظر میں
ایک اَن دیکھا سفر جاری ہے
غرفۂ خواب نہیں قبرِ ضمیر
موت تو آخر بیداری ہے

وطن کے لئے

اے میرے وطن
ایام ابھی جاں سرد بہت
اس گرد کے اندر درد بہت
کالے بازار پسند نہیں
یہ غربت اور جہالت کے
مہلک آزار پسند نہیں
راشی عمال کی ممدوحہ
"فاشی سرکار" پسند نہیں
کچھ بھلے نہیں حالات، مگر

بے رنگ سہی دن رات، مگر
میں تجھ سے محبت کرتا ہوں
اک درد بھرا پیمانِ وفا
اس خاکِ شفا سے رکھتا ہوں
گو سانس نہیں لے سکتا میں
لیکن میں چیخ تو سکتا ہوں

انقلابِ ایران

معجزہ ایثار کا، کردار کا، ایمان کا
انقلاب ایران کا ہے، انقلاب انسان کا

بے سروسامان نے سامان کو دی ہے شکست
وقت کے سب سے بڑے "شیطان" کو دی ہے شکست

"آریہ مہری" کی نخوت کا عَلَم خم کردیا
کبر کے قد کو ہمیشہ کے لئے کم کردیا

خوف کی اک تھرتھری طاغوتیوں کے گھر میں دیکھ
قصر کے کنگروں کو اک درویش کی ٹھوکر میں دیکھ

فقر کی شاہی کا آمر دشمنی کا انقلاب
اس زمانے میں حسینؓ ابنِ علیؓ کا انقلاب

آ نہیں سکتی تھی جو آواز... تارِ ساز تک
پھر وہ نغمہ جاگ اٹھا لاہور سے شیراز تک

خانۂ ویراں میں جشنِ خانہ سامانی ہے یہ
دھوپ کے آشوب میں شبنم کی طغیانی ہے یہ

عام انساں کا شریکِ حال ہے ہر حال میں
حکمرانوں کو بٹھا دے قصر سے چوپال میں

روحِ جاں پر اس صدی کا معجزہ لکھا گیا
پرچمِ خسرو پہ اسمِ مصطفیٰؐ لکھا گیا

حبس کے صحرا میں دریا کی ہوا ہے انقلاب
بندۂ مزدور کا روزِ جزا ہے انقلاب

جلتے چناروں کے نام

وادیِ کشمیر کے جانباز فرزندو سلام
جبرِ حق میں اے خدا کے منتخب بندو سلام
سبز دھانوں کو دُعا کیسر چناروں کو سلام
زندگی کے خوبصورت شالاماروں کو سلام

شب فروشوں سے یہ صبحِ ایشیا کی جنگ ہے
یہ فراتِ عصر پر پھر کربلا کی جنگ ہے
جھیل ڈل کا "چھل" سلامت، چشمہ۔ شاہی کی خیر
زعفراں زاروں کی ہر معصوم چرواہی کی خیر

کُود جاتے ہو تڑپتی بجلیوں کو تھامنے
مسکراتے ہو برستی گولیوں کے سامنے
رزم گاہوں میں گمکتے، کسمساتے، جُھومتے
سامنے ٹینکوں کے ننگے بازوؤں کو چومتے

جسم پر ہر زخم کو پہنا ہے زیور کی طرح
خاکِ مقتل اوڑھتے ہو ماں کی چادر کی طرح
اپنی چھب کے ساتھ ہر موسم میں جینے کی یہ جنگ
اپنے اسلوبِ تمدّن کے مدینے کی یہ جنگ

اپنے خوں کے غُسل سے کتنی نکھر جاتی ہے موت
موت کا ڈر ختم ہو جائے تو مر جاتی ہے موت

بن زائی جاپان

برطانیہ نے سنگاپور میں اپنا عظیم الشان بحری مستقر ۱۹۳۹ء میں جنوب مشرقی ایشیا کے عوام کی ہڈیوں پر تعمیر کیا اور جنوری ۱۹۴۲ء میں جاپانی ہوابازوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی ۔ ا

اس لوہے میں دفن ہزاروں ہڈیاں انسانوں کی
چینی، ہندی، سیلونی....
مزدوروں، سوختہ جانوں کی
تاکہ ہند اور بحرِ ہند میں
پھیلی پورب دھرتی میں
راج کبھی تاراج نہ ہو انگریزوں کا
جاوا اور ملایا کی......
بحری کھاڑی کے سینے میں
سنگاپور کے....

"دو بحری تربینے میں"

فولادی بُرجوں والا۔۔۔

آہن قلعہ تعمیر کیا

شاطر مغرب سمجھا مشرق کا آہو نخچیر کیا

آزادی کے سورج کو زنجیر کیا

جل گئے لاکھوں جسم

فرنگی ساختہ "آگن مشینوں" میں

اُن کے خون کی سرخی سے

بانات بچھی۔۔۔۔۔۔

لندن کے شاہی زینوں، بحری سفینوں میں

نرل دھان ان سبز سروپ جزیروں کا

(چاول کھلے ذخیروں کا)

کیک بنا برمنگھم میں

کندن۔۔۔ ٹین اور ربڑ ملایا برما کا

شیر مادر۔۔۔۔

انگریزوں کی استحصالی غارت کا

"لندن ٹاور"[1] میں گروی۔۔۔

یہ سارا مال تجارت کا

توپ تھی بحرِ ہند میں۔۔۔

اور گولہ صحنِ جاپان میں تھا

ایک یہی کانٹا تو کھٹکتا۔۔۔۔

سینہ سا انگلستان میں تھا

اب وہی حاکمِ ہفت اقلیم

وقت کی ضربت سے دو نیم

راج سمیت، اناج سمیت، خراج سمیت

اپنے تخت و تاج سمیت

اپنا سورج ساتھ لئے

ڈوب گیا ہے

اس کھاڑی کے گہرے نیلے پانی میں

بولو نعرہ "بن زائی"[2] کا "نپن"[3] کی جاپانی میں

۱۔ بالیٹنہ پارک، سنگاپور

۲۔ جاپانی زبان میں زندہ باد

۳۔ جاپانی اپنے آپ کو نپن Nipon کہلانا پسند کرتے تھے

ازبکستان کے یوم آزادی پر

شعر کا شہکار ہے، تہذیب کا بازار ہے
ازبکستان ایشیا کی روح کا اظہار ہے

اس زمیں پر رُک کے گزری ہے ستاروں کی برات
اس کے میناروں سے جُھک کر آسماں کرتا ہے بات

علم و حکمت کا خزینہ اور زینہ تاشقند
ہر حسیں خط سے حسیں تر، ہر بلندی سے بلند

یہ ہمارا اک برادر جاں برادر اور ہے
یہ مری تاریخ کا کھویا ہوا لاہور ہے

قائد اور ہم

کفر کی سوداگری اسلام کے پرچم سے کی
قحط کی کشت آوری برسات کے موسم سے کی

نفرتوں کی دھند میں کفنائی چاہت چاندنی
دوستی پتھر سے رکھی، دشمنی شبنم سے کی

یہ سفر درماندگی اس جرم کی پاداش ہے
بے وفائی ہم نے کی اور قائدِ اعظم سے کی

قبر کتبہ

زندہ لوگو!

تم کو کیا معلوم ہے
زندگی میں کس قدر رویا ہوں میں
کتنی مدت جاگ کر سویا ہوں میں

ایک روشن چراغ

(راجہ محمد افضل خان کی یاد میں)

شخص اپنی افضل و اعلیٰ الگ پہچان کا
مر کے زندہ کر گیا جو مرتبہ انسان کا
خاکِ جہلم، کر گئی سیراب تجھ کو اس کی ذات
ایک دریا تھا، کہ جو بہتا رہا صحرا کے ساتھ

اپنی 77 ویں سالگرہ پر

میرے لفظوں میں ابھی شاید وہ غم اُترا نہیں
سینچ سکتا جو بشر کی کِشتِ کم اوراق کو
قبر کی جانب رواں روزانہ رہتا ہوں، مگر
موت کہتی ہے یہ کانوں میں، ابھی زندہ رہو

ایک کیفیت

دل کے کن کن ارمانوں سے اپنا پیار نبھا ہوں میں
مٹی پر سوتے سوتے اٹھوں تو اڑنا چاہوں میں
جسم کا چاؤ اگن الاؤ، روح میں سرد اداسی بھی
میں بستی کا باسی بھی، میں جنگل کا سنیاسی بھی

زندگی

آنسوؤں میں بھی چمکتی کہکشاں ہے زندگی
اے خدا انساں پہ کتنی مہرباں ہے زندگی

اک مسلسل رنگ، حسنِ بے کراں ہے زندگی
دیکھنے والو، زمیں تا آسماں ہے زندگی

"ہر زماں آنے دگر، شانے دگر، جانے دگر"
خالق و مخلوق کا عشقِ جواں ہے زندگی

کتنے "دردیلے دُکھوں" محرومیوں کے باوجود
سردیوں کی صبحِ صادق کا سماں ہے زندگی

ایک بہتا نیل و سیمِ جستجوئے بے کنار
ہم نے کم دیکھی ہے ورنہ بے کراں ہے زندگی

جاں کے سنّاٹے میں زمل گنگناتی چاندنی
ریت کے ٹیلوں میں دریائے رواں ہے زندگی

اے اسیرِ گنبد و مینارِ سنگِ سرخ و سبز
مطمئن گھر میں شبستانِ شہاں ہے زندگی

رم کرے لفظ اس کے نم سے، اس سے پھولوں کے خیام
بے زباں مٹی کی الہامی زباں ہے زندگی

فرد کی قوّت ہے اک محکم اکائی یہ ضمیر
بس اسی سچ کی حقیقت ترجماں ہے زندگی

بلوچ کا ورثہ

جانِ پدر

اے کہ تُو ہے نورِ نگاہ و آنِ پدر

نامِ خدا

پھوٹ پڑیں اب تیری مسیں

قوسِ جسارت جاگ پڑی

جاں کی "عبارت" جاگ پڑی

لے میری شمشیر اٹھا

رن میں جا

میرا ورثہ

اک گھوڑا، دو اونٹ اور یہ

نامی تلوار

میرے بزرگوں

مرے قبیلے کا روشن زندہ کردار

اس کردار کو زندہ رکھ

دیکھ کبھی یہ سر زندہ ہو

اس کا لوہا سرخ تو ہو

زر زندہ ہو

اس تلوار کو زندہ رکھ

اس کردار کو زندہ رکھ

آزادی

بے عزم و عمل کوئی منزل نہیں سر ہوتی
چلتے تھے چٹانوں پر غوری ہو کہ ابدالی
محتاج نے کب پائی اقوام کی آزادی
قوموں کو نہیں ملتی خیرات میں خوش حالی

دوبئی میں

اے سوادِ شہرِ روشن روزگاراں دوبئی
ہیں ترے اطراف میں کتنے مقاماتِ جلی
نام ان سب کے سبک الفاظ سب اچھے لگے
بس گیا دل میں مگر جو نام ہے "جبلِ علیؑ"

پتھر کا عقاب

دوبئی کے ایک رنگیں چوک میں ساکت کھڑا
یہ جو پتھرایا ہوا پتھر کا اک شاہین ہے
سنگِ جامد کے پروں میں "بالِ جبریلی" کہاں
باز ہے لیکن کبوتر کی طرح مسکین ہے

فن اور تاریخ

دوبئی کی ہر عمارت ہے کمالات آفریں
مال و زر میں "مین ہٹن" نیویارک کی یہ جانشیں
دہلی و لاہور کی "من میت" سنولاہٹ کہاں
فن کی جدت ہے، مگر تاریخ کی عظمت نہیں

درختوں کا گیت

سبز جھومتے درخت کتنے خوبصورت ہیں
جسم کی جوانی ہیں، سانس کی ضرورت ہیں

ان کو عام کرنا ہے
یہ تو کام کرنا ہے
منظروں کی خوش رنگی..... خوشنما درختوں سے
یہ زمیں نکھرتی ہے..... جابجا درختوں سے

ان کو عام کرنا ہے
یہ تو کام کرنا ہے
آنگنوں میں بھرنا ہے رنگ گلستانوں کا
پھول چوس لیتے ہیں زہر کارخانوں کا

چادروں میں شاخوں کی چاہ گاؤں جیسی ہے
دھوپ میں درختوں کی چھاؤں ماؤں جیسی ہے

ان کو عام کرنا ہے
یہ تو کام کرنا ہے
چاہتوں کے ڈیروں کو راحتوں سے بھرتے ہیں
آدمی سے "من موہن دوستی" بھی کرتے ہیں
شہر شہر کو بخشیں آسمان پیڑوں کا
فرد فرد ہو اپنا باغبان پیڑوں کا

ان کو عام کرنا ہے
یہ تو کام کرنا ہے

فردائے امروز

یہاں جشنِ بہاراں ہو گا، لیکن ہم نہیں ہوں گے
بیاباں میں گلستاں ہو گا، لیکن ہم نہیں ہوں گے

کشادہ شاہراہیں پتھروں کے دل سے نکلیں گی
سفر، گھر سے بھی آساں ہو گا، لیکن ہم نہیں ہوں گے

وہ جسکی چھت کی کڑیاں، بھوک کے جالوں سے "بھریاں" ہیں
یہ کچا گھر بھی ایواں ہو گا، لیکن ہم نہیں ہوں گے

ہنسے گی دخترِ دہقان لیکن ہم نہ دیکھیں گے
یہی مزدور سلطاں ہو گا لیکن ہم نہیں ہوں گے

یہاں "سُرسیل" گاتے گا مگر ہم سن نہ پائیں گے
یہ چپ رستہ غزل خواں ہوگا، لیکن ہم نہیں ہوں گے

ہر اک خاموش، گرد آلود، غم افزودہ پنگھٹ پر
ہجومِ گل عذاراں ہوگا، لیکن ہم نہیں ہوں گے

جہاں اب لوگ تنہائی کے سنّاٹے میں جیتے ہیں
یہ قریہ شہرِ یاراں ہوگا، لیکن ہم نہیں ہوں گے

وہ سورج زندگی کا جو گھروں میں قید ہے اب تک
منڈیروں سے نمایاں ہوگا، لیکن ہم نہیں ہوں گے

جہاں مٹی کا میلا سا دیا بھی جل نہیں پایا
ستاروں کا چراغاں ہوگا، لیکن ہم نہیں ہوں گے

مسلسل خشک سالی قحط کی جس پر مسلّط ہے
وہاں بھی سیلِ باراں ہوگا، لیکن ہم نہیں ہوں گے

مجبوری

وہ لڑکی گہنے کیا پہنے
جو اپنے جسم سے
اپنے حسن و جمال کی شال سنبھال کے
اپنا رنگ بدن جھلکا نہ سکے
جو اپنی شیتل آنکھوں میں
سوتے ہوئے خواب جگا نہ سکے
خود اپنے خیال کو پا نہ سکے
اپنے بلوریں شانوں سے

ریشم کی طرح گرتے ہوتے بال اُٹھا نہ سکے

جو سارے جسم میں گاتی ہے

وہ جھانجھر ہونٹ پہ گا نہ سکے

سورج کے سامنے کھڑکی میں

اک کن جھمکے ہم کو جھمکا نہ سکے

وہ حسن و جوانی کا عالم

جو شہر نگر میں سما نہ سکے

لیکن یہ رواج زندگی لڑکی

اک اپنی یاد حویلی کی دہلیز سے باہر جا نہ سکے

اک ہم جھولی، ہم بن لڑکا

من مندر اندر رہا کرے

اک جادو اس کے ہونٹ میں ہے

اس گبھرو کو آگاہ کرے

وہ اس کے لمس کی چاہ کرے

جب دیکھے اس کو واہ کرے

دل تڑپے اس سے بیاہ کرے

لفظوں کے سمندر سے، لیکن

اک لفظ لبوں تک آ نہ سکے

وہ لڑکی گہنے کیا پہنے

راستے کی چاپ

مل گئی ایک پرانی کاپی آج مجھے الماری سے
یادوں کا دریا بہہ نکلا میری خواب پٹاری سے

اک اک نقش سے چھن چھن نکلی جوت پرانی یادوں کی
کچھ چہرے خوش قد لڑکوں کے، کچھ شکلیں استادوں کی

پہلا شعر جو لکھا تھا کیکر کے تلے اک گاؤں میں
ہنسی کسی کے ہونٹوں پر اور کانٹے میرے پاؤں میں

آڑی ترچھی نرم لکیریں دل کی سچل تحریریں ہیں
جن کو چپ چپ پوجا یہ ان ناروں کی تصویریں ہیں

کچھ صفحوں پر پنسل سے جو نرم نشان بناتے ہیں
کچھ گلیوں کے موڑ ہیں ان میں کچھ پیڑوں کے سائے ہیں

ٹھوڑی سے حسنا کی وہ بلّور کلائی یاد آئی
کھیت میں اٹھتی سرسوں کی کافر انگڑائی یاد آئی

رنگیں کلغی طاؤسوں کی، پتلے سینگ غزالوں کے
عکس جوانی سے پہلے کے رنگ برنگ خیالوں کے

بے ترتیب اک زائچہ میرے بیتے ماہ و سال کا ہے
اک اک "ایرے" اندر اک اجڑا ہوا شہر خیال کا ہے

بول پڑے سب نقطے شوشے یادوں کی شہنائی میں
جاگ پڑا مدت کا سویا شہر مری تنہائی میں

دیکھ رہا ہوں چند شناسا نمبر "ٹیلی فونوں" کے
راتوں کو بنتے تھے جن پر منصوبے "شب خونوں" کے

تھام مجھے اے وقت کی ظالم گردش تھم کر تھام مجھے
آج اچانک یاد آئے کیا پیارے پیارے نام مجھے

وہ اک لڑکی

وہ اک لڑکی شرمیلی سی
چہرہ چہرہ بھی گیلی
چتون تیکھی نوکیلی سی
آنکھوں میں کجلا ہلکا سا
سر سے دوپٹہ ڈھلکا سا

اک مست غزال جوانی میں
مچھلی دریا کے پانی میں
برساتی نہر روانی میں

لاہور کا روپ بہاروں پر

کشمیر کی آگ چناروں پر

اک ریشم رنگ گلہری سی
کچھ گونگی سی، کچھ بہری سی
ٹخنوں تک زلف سنہری سی
بانہوں کی قوس بناتے جب
ساری دنیا کو گھیرے وہ
چھلکاتے رین بسیرے وہ
مرے اُجڑے خواب "اُتیرے" وہ
گُل رنگ حنائی ہاتھوں سے
مرے سر کے بال بکھیرے وہ

لیکن جب میں کچھ بات کروں
اظہارِ محسوسات کروں
آنکھوں، ہاتھوں اور ہونٹوں سے
دل راحت کی مُسکان لئے

من چاہت کی برسات کروں
ڈرتے ہوتے پنکھ پکھیرو سی
ہنستی ہنستی چپ ہو جاتے
چہرے پر کسی رسالے کی
اک جھالر تان کے سو جاتے
اَن دیکھے اور بے پرکھے
رنگوں، راسوں، وہموں، سپنوں میں
گُم ہو جاتے
سب جسم سمیٹ کے کسی افق میں کھو جاتے

لیکن جب میں رخصت چاہوں
اور اس سے کہوں
اے لڑکی مجھے اجازت دے
بے چین تڑپتی مچھلی سی
تن سے گزرے اور باطن کو
دونوں ہاتھوں سے گھیرے وہ

اک مستی "چار چفیرے" وہ
(کیا سندر شام سویرے وہ)
اک ذہن ہزار نراش لئے
صحرا کی ریت اداس لئے
اک ساعتِ وصل کی خواہش میں
کچھ زرد سی صدیوں پر پھیلا
دکھ درد کا اک بن باس لئے

وہ رنگ بدن جیسا جیسا
چھلکے منہ زور جوانی میں
جہلم کے بھرے دریا جیسا
ہونٹوں پر مہر صداقت کی
اور ماتھے پر اک لگی شام ملاحت کی
ہونٹوں پہ تھرکتی راحت بھی
اور مست منوہر آنکھوں میں
اک خوفزدہ ہرنی کی جھجکتی چاہت بھی

چہرے اور باتیں

جاگ اٹھی ہے اک کسک
یادیں کتنے برسوں کی
کتنی فصلیں سرسوں کی

مشعلِ جاں میں
روشن، روشن لمحوں کی باراتیں ہیں
دل میں کتنے چہرے ہیں
لب پر کتنی باتیں ہیں

بنگلے کے حاشیے میں

وہ جو ایک بنگلہ ہے
"شارعِ صنوبر" پر
شہر کے حواشی کو چُومتے سمندر پر

اس زمین پر پہلے
دس کسان کنبے اپنے جھونپڑوں میں رہتے تھے

پاگل دیوالی

وہ دیکھو کہسار کی نیلی
اونچی نیچی، ٹیڑھی میڑھی
چوٹی پر
چیڑ دیار بیار کے
آپس میں اُلجھے ہوتے کالے جنگل میں
آگ لگی ہے
جس کے روشن بر ہم "بھانبھڑ"
پھیل گئے ہیں میلوں تک، ٹیلوں تک
"کیکر اور پھلاہی" والے

دھند اوڑھے میدانوں میں
سوئی ہوئی چاندی جھیلوں میں
تم بھی اپنے دل میں
اک خاکسترِ غم تو رکھتے ہو
مانا یہ افسردہ ہے، غم خوردہ ہے
آج افق کی اس پاگل دیوالی میں
تم بھی
اپنے ارمانوں اور خوابوں کی بکھری ہوئی لَو کو
ماضی کے جنگل سے نکلی
مستقبل کی اس زندہ، تابندہ ضَو کو
ان شعلوں میں شامل کر دو

سیکنڈ ہینڈ عورت

کس قدر رعنائیاں
دانائیاں، رسوائیاں
کتنی تہذیبوں سے ہم آغوشیاں
...... جسم سے وہ روح کی
سرشاریاں، سرگوشیاں
کتنے شہر اس جسم میں
کیسے کیسے شہد.....
کیسے کیسے زہر اس جسم میں
روح میں جلتے الاؤ

زندگی کے راستے میں ان درختوں کے پڑاؤ

عارضی تھی جن کی چھاؤں

لیکن ہر زخمِ بدن اک روشنی

ذہن کتنے تجربوں کی کہکشاں

وقت کتنی لذتوں کا رازداں

فاصلے اور قربتیں

ماستا اور مجلسیں

کتنا رس،

کتنا نم اور کتنا غم

اس ملگجے پیکر میں ہے

مائی ہرروز فرخ شیر کی اقامت گاہ پر

میرا شہرِ گلاب ابھی آگے ہے

(اپنی ۳۰ ویں سالگرہ پر)

یہ راہ گزر ہے جس کے لئے
سب رختِ سفر ہے جس کے لئے
بیتاب نظر ہے جس کے لئے
خالی مرا گھر ہے جس کے لئے
وہ شہرِ گلاب ابھی آگے ہے
وہ قریۂ خواب ابھی آگے ہے
میں ایک وصالِ مسلسل ہوں
اُگتا ہوں نئی فصلوں سے میں

اک عہدِ جوانی رکھتا ہوں
آئندہ کی نسلوں سے میں
مرا عہدِ شباب ابھی آگے ہے
وہ قریۂ خواب ابھی آگے ہے
مرا شہرِ گلاب ابھی آگے ہے
صحرا صحرا جلتا ہے ابھی
کچھ لوہے کو گلتا ہے ابھی
اے جسم ابھی مت تھک جانا
چلنا ہے ابھی، چلنا ہے ابھی
یہ ریگِ گرسنہ کہتی ہے
مری راحت کا، مری چاہت کا
بھرپور سُرورِ حسرت کا
دریائے چناب ابھی آگے ہے
وہ قریۂ خواب ابھی آگے ہے
مرا شہرِ گلاب ابھی آگے ہے
اے میرے قلم مت رک جانا

اک اور کتاب ابھی آگے ہے
میرا ماضی پیچھے گاتا ہے
فردا کا رُباب ابھی آگے ہے
مرے نام کا جام سنبھال رکھو
مری شامِ شراب ابھی آگے ہے
ناکردہ گناہوں سے کہہ دو
مرا تم سے حساب ابھی آگے ہے
وہ قریۂ خواب ابھی آگے ہے
مرا شہرِ گلاب ابھی آگے ہے

وارننگ

اپنی امن کھیتی میں
قحط کو نہ اُگنے دو

بھوک کو نہ بونے دو
اپنے شانت شہروں میں

گیت کو نہ رونے دو
زندگی کے بازو پر

موت کو نہ سونے دو
اپنی لڑائی میں

فتح ...... لافِ بے معنی
جنگ جیتنی ہے تو جنگ کو نہ ہونے دو

دل کے زخم سینے دو
آدمی کو جینے دو

خوف

ہر وقت ہی ڈر میں رہتے ہیں
ہم کس کے گھر میں رہتے ہیں
دریا خائف اُن لوگوں سے
جو لوگ بھنور میں رہتے ہیں

حقیقت

دو حقیقتوں پر ہی مدارِ زندگانی ہے
ایک شے محبت ہے، ایک شے جوانی ہے
باپ کی حویلی میں جس طرح تھی ماں میری
یہ پرانی دھرتی بھی کس قدر سہانی ہے

شناخت

میں جس سے محبت کرتا ہوں
وہ جسم ہے، لیکن جسم نہیں
وہ خواب ہے، لیکن خواب نہیں
اُس جیسا کوئی پھول نہیں
اس سا کوئی مہتاب نہیں

بے چین ہے وہ
صحرا کی ہواؤں کی صورت
زخمی ہے وہ....
کوئل کی صداؤں کی صورت

اک اڑتا بادل ساون کا

اک شہد لبوں کے ساتھ لگا

ایک شہر دلوں کے درشن کا

اک عہد کہ جو تحریر نہیں

اک نقش کہ جو تصویر نہیں

(زنجیر مگر، زنجیر نہیں)

اک "پینگ الارا" سپنوں کا

اک "گینڈ گواچا" بچپن کا

اک ننگی تتلی رقص کناں

پھولوں، پودوں، دریاؤں میں

امرت، مندر کی تھالی کا

یا مسجد کے مینارے تھے

اُٹھتے ہوئے ہاتھ دعاؤں میں

روشن امید جوانی کی

اک لہر کسی----

بے نام چناب کے پانی کی

بن باس میں جنگل کی خوشبو......

بھٹکی ہوئی جو دھابائی کی

آواز کسی شہنائی کی

خوش خلق بھی ہے، معزور بھی ہے

وہ پاس بھی ہے، وہ دُور بھی ہے

اک نہر جو مرے خیالوں میں

اونچے برفیل پہاڑوں کی

"ہنزہ نگروں" میں بہتی ہے

لیکن میرے من میں رہتی ہے

میں جس سے محبت کرتا ہوں

گاؤں

خواب آلودہ کسی اجلے بچھونے کی طرح
زندگی گاؤں میں تھی پارے کے سونے کی طرح
آدمی مفلس تھا، لیکن زندگی خورسند تھی
گاؤں کی دنیا غریبی میں بھی دولت مند تھی

انصاف

ہیگل و اسپنسر و اینگلز جو چاہیں کہیں
ہم نے یہ مانا کہ ہر اک صاحبِ اوصاف ہے
قول لینن کا مگر سب سے سوا شفّاف ہے
فیصلہ مزدور کے حق میں ہو تو انصاف ہے

تنہائی

آہ یہ ویران تنہا زندگی
ایک بوڑھے شخص کا
دیدۂ بے خواب ہے
ہنزہ و گلگت کے اونچے پہاڑوں
کے تلے
دُور... چرواہوں کے کچھ اُجڑے ہوئے
ڈیروں سے دُور
زندگی کے ریشمیں گھیروں سے دُور
موسمِ سرما کا اک سُوکھا ہوا تالاب ہے

پارہ آپ بیتی کا

میں کہ تھا انگریز کے طوقِ غلامی کا اسیر
زندگی میں بارہا صادر ہوئی مرگِ ضمیر

تاجِ انگلستان کا گروی رہا میرا بدن
میری کپتانی کی وردی تھی مرا پہلا کفن

جنگِ عالمگیر کے تمغے جو یہ سینے پہ ہیں
مستقل ذلت کے دھبے دل کے آئینے پہ ہیں

اپنے سپاہی بیٹے کے نام

(عزیزم سید احتشام ضمیر کو ملٹری اکادمی کاکول کی پاسنگ آؤٹ پریڈ میں دیکھ کر)

اے مرے نورِ نظر، لختِ جگر، جانِ پدر
میری شاخِ با ثمر، میری دعائے بار ور

تُو مرے گھر کا اجالا، تُو مرے رستے کا نور
تُو مری تہذیب کا ورثہ، مرے فن کا غرور

یاد ہے تیری برومندی کا اک اک دن مجھے
ہم نے کس چاہت، کن ارمانوں سے پالا تھا تجھے

پاک لشکر کا جواں بننا مبارک ہو تجھے
اپنا پرچم تھام کر چلنا مبارک ہو تجھے

تیری "وردی" سے مقدس پیرہن کوئی نہیں
زندگی کا اِس سے بڑھ کر بانکپن کوئی نہیں

ب ۱۹۹۵ء میں بریگیڈ ز بے (ض)

ہم اداس رہتے ہیں

ہر خوشی کے پیچھے اک دوسری خوشی چمکے
ہر خوشی بلاتی ہے
اک چراغ بُجھتا ہے
اک چراغ جلتا ہے
کاروان چلتا ہے
لوگ ان چراغوں کے
رائیگاں تعاقب میں، بدحواس رہتے ہیں!
زندگی کے ڈیرے میں
روشنی کے گھیرے میں
ہم اداس رہتے ہیں

ادراک

دفترِ فکر ہے، ہر رمز کتابِ ہستی
بات یہ ہے کہ ہمیں بات کا ادراک نہیں
کوئی شے کمتر و بہترِ حدِ افلاک نہیں
چیونٹی سا بھی کوئی مہلک و سفاک نہیں

لچک

کوئی بھی چیز غیر ضروری نہیں یہاں
بے رنگ کائنات سما و سمک بغیر
جس طرح جنگ میں کوئی لشکر کُمک بغیر
جس طرح آدمی کا ارادہ لچک بغیر

تین شعر

وہ چلن چلا تلواروں کا
پھولوں پہ ہے پھل تلواروں کا

ہر جنگ میں قتل ہزاروں کا
اک کھیل ہے راج کماروں کا

اس عہد میں ٹوٹ گیا لوگو
سر سے رشتہ دستاروں کا

کوریائی نظمیں

ڈاکٹر چانگ سو کو (Dr. Chang Soo Ko) ۱۹۹۳ء سے تاحال پاکستان میں جنوبی کوریا کے سفیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ اپنے ملک کے ایک نامور شاعر، مصنف اور دانشور ہیں۔ ذیل کی چند نظمیں انہی کی شعری تخلیقات سے ماخوذ ہیں۔

طلسمِ شب

چاندنی کی راتوں میں
باوقار پیڑوں کے شاخسار گاتے ہیں
چاندنی کے دریا میں خواب سے نہاتے ہیں

شام سائے

غروبِ شام کے سائے جھکے ہیں آسمانوں سے
فضا میں بھر گئی ہیں
گاؤں کے بچوں کی آوازیں
جو اپنی ننھی ننھی ٹولیوں میں
سادہ سادہ
پیاری پیاری بولیوں میں
ایک سچی زندگی کے گیت گاتے ہیں
سنہری تتلیوں کے گرد چوپالیں بناتے ہیں
قریب و دُور کے نغمے

دلِ مسرور کے نغمے...... غمِ مستور کے نغمے
ہمیشہ اجنبی لگتی ہیں یہ مانوس آوازیں

دعائیں بھر گئی ہیں اس شفق آباد وادی میں

اُس کا چہرہ

اس کے زرد چہرے کی
سوچتی لکیروں میں
کچھ خیال چلتے ہیں
کچھ چراغ جلتے ہیں

روشن خیالی

آسمانِ معزب میں
پورا چاند
زہری ناگ مشرق میں
میں مستی سے چلّایا... دل آہا!
اک آواز سنائی دی تُو احمق ہے

سلام آباد کی شام

شہر اسلام آباد کی رنگیں روشن شام
سورج وقت غروب اشجار کی نرم لچکتی شاخوں میں
جیسے رستا اور چمکتا قرمز قطر سنہرا آم

سندھی آم

میرے شعروں میں ہے جو الفاظ کی اک نرم رگ
اور اک احساس کا بہتا ہوا شیریں نفَس
ہے سوادِ سندھ کے آموں کا رَس !

جھلمل چاند کنارے پر

میری جہازی دو لخت ہوئی
شاخیں..... گھوڑوں کی دُم کی طرح لہراتے ہیں
بل کھاتے ہیں
اک بہتی سمت میں حرکت ہے
احساسِ رواں
ہوں دو سائے ہم آغوش جہاں
اک جھلمل چاند کنارے پر

آڑو شگوفے

روشنائی کا اک خفیف نشاں
کسی قرطاس پر جو رہ جائے
داستانِ حیات کہہ جائے

(2)

میرے ہاتھوں میں کوئی لرزش نہیں
بلبلے تالاب کے ساکت ہوئے
قعر میں ہوتا ہے کرب
سطح پر ہوتا نہیں

(3)

یہ گُل کلیاں
یہ بادل ہیں
یہ انساں ہیں

"مکڑے نے کہا"

زمینِ زندگی کا زرد و سفاک جرثومہ
اندھیرے کی تہوں میں رینگتا آیا مری جانب
مگر کب چھو سکا میری تمناؤں کے جالوں کو

شاخ سے ٹوٹا

وقت کے ہاتھوں میں یہ ٹوٹا ہوا برگ گلاب
گھر کے اک کونے میں......
پر بُردہ کسی گلدان میں
بانٹتا ہے اب بھی......
اک اک نیم زندہ تارِ برگ
اپنی خوشبوؤں کی......
رنگوں کی رسیلی راحتیں
زندگی کی چاہتیں
سُرمئی آفاق کو

بخشی ہیں کتنی غیرفانی اور سنہری ساعتیں

اس وقت سے

جو اس کے ریشوں نے بنا!

قرینے کا قرض

وہ بھی چیزیں جن پہ انساں کی نظر تھمتی نہیں
زندگی پر ان کا بھی حق ہے مدام
منتظر ہیں وہ بھی اک اُجلے قرینے کے لیے
تھام تو سکتی نہیں گرتے ہوتے لمحات کو
لیکن ان کے رنگ اور رس کی امانت دار ہیں

تین شعر

اپنا اپنا جینے کا زاویہ بھی ہوتا ہے
سورج ایک ہے لیکن دن نیا بھی ہوتا ہے

دوستی میں اک ایسا بھی مقام آتا ہے
گفتگو نہیں ہوتی رابطہ بھی ہوتا ہے

فرطِ غم سے آنکھوں میں اشک آ ہی جاتے ہیں
احتجاج بعض اوقات برملا بھی ہوتا ہے

حرفِ آخر

نبیوں کا سرنامہ وہ سرتاج امام اماماں
جس سے جلمک جلمک "صبحاں" روشن شاماں

واپس آ گئیں نیام خیام میں گُھپ قاتل تلواریں
ٹوٹ گئیں دلانوں اندر نفرت کی دیواریں

عدل و تمدن و مروّت کا وہ بندوبست الٰہی
شاہی میں درویشی کی چھب، درویشی میں شاہی

جسؐ کا اک اک لفظ ستارہ، موتی موتی باتاں
حبس کے موسم میں برساتیں ساون کی "برساتاں"

محنت کش کی سچی "عزت" اجر اور اُجرت پوری
حاکم اعلیٰ مزدوروں کے ساتھ کرے مزدوری

راجے راہوں میں آ کر پرجا کے کاج سنواریں
لوگوں نے دیکھیں اپنے دروازے پر سرکاریں

موروثی شہزادے باقی، تاں کوئی جنم ابھاگی
یثرب کے سو بھاگ نگر میں ایک نئی رُت جاگی

اسؐ کی دانائی دانائی، نطق اسؐ کا الہامی
جس پر اُس کی مہر نہ ہو اُس درس آدرش میں خامی

نوری نہریں بہتے بہتے، شہر نبیؐ کی گلیاں
حلم کے شہد کا بہتا دریا، باتاں "بشری ڈلیاں"

جس کی ذات اور بات سے بندہ رب اپنا پہچانے
جس کے دستخطوں سے جاری جنت کے پروانے



ضمیر جعفری کا فن سادہ و پرکار ہے' انہیں کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں۔ گردوپیش کا کوئی پہلو ان کی نظر سے نہیں بچتا۔ ان کی آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے' وہ ان کے لب پر کچھ اس طرح آتا ہے کہ اس میں ان کے مزاج کا لوچ اور زبان و بیان کی بے شمار حلاوتیں شامل ہو جاتی ہیں' وہ زندگی کی بوالعجبی اور انسانی کمزوریوں کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ ان پر بے اختیار پیار آنے لگتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے اسلوب کو فارسی کے اعجاز' اردو کی کاٹ' اور پنجابی کی بھرپور توانائی نے ایک نیا آہنگ بخشا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی